فہرست

لمعات:

نکاح کے لئے بلوغت شرط ہے	ادارہ	3
ایک سدابہار عالمِ دین	بشیر احمد عابد' کویت	5
مسلمانوں کے باہمی اختلافات کا اصل سبب	خواجہ ازہر عباس' فاضل درسِ نظامی' کراچی	17
میری زندگی کا سفر	ڈاکٹر شگفتہ طاہر' کراچی	28
حضرتِ انسان قرآن کے آئینے میں	آصف جلیل' کراچی	39
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ)	غلام احمد پرویزؒ	43

احادیث نبوی ﷺ

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے ام المومنین! ایک شخص رات کو زیادہ سوتا ہے اور کم عبادت کرتا ہے اور دوسرا زیادہ عبادت کرتا ہے اور کم سوتا ہے آپؓ کے نزدیک دونوں میں سے کونسا زیادہ پسندیدہ ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک دفعہ ایسا ہی سوال رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپؐ نے جواب میں فرمایا تھا کہ ان میں سے جو زیادہ عقلمند ہے وہ۔۔۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے تو ان کی عبادت کے متعلق پوچھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے عائشہؓ! ان کی عقلوں کے متعلق سوال ہوگا پھر جو شخص زیادہ عقلمند ہوگا وہی دنیا اور آخرت میں افضل ہو گا۔ (کتاب الازکیا۔ ابن جوزی)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ادارہ)

لمحات

نکاح کے لئے بلوغت شرط ہے

گذشتہ دنوں سعودی عرب کے مفتی اعظم کی طرف سے ایک فتویٰ شائع ہوا کہ اسلام کی رو سے دس سال کی بچی سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اس کے تتبع میں پاکستانی مفتیانِ دینِ متین بھی میدان میں کود پڑے اور فتاویٰ کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ انہوں نے البتہ مہربانی فرماتے ہوئے یہ کہا کہ 10 سال کی بچیوں سے نکاح واجب نہیں ہے لیکن کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے عائلی قوانین کی رو سے نکاح کی عمر طے ہے جو کہ لڑکی کے لئے 16 سال اور لڑکے کے لئے 18 سال ہے۔ آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس ضمن میں کتاب اللہ سے کیا راہنمائی ملتی ہے۔ قرآن نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے۔ جو تراضیٔ مابین (فریقین کی مرضی) سے طے پاتا ہے۔ **وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقاً غَلِيظاً** (4:21)۔ دنیا کے ہر قانون میں معاہدہ (Contract) کے لئے بالغ ہونا شرط ہے۔ قرآن کا اعجاز ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے بلوغت کو نکاح سے تعبیر کیا ہے یعنی بلوغت اسے کہتے ہیں جب لڑکا یا لڑکی نکاح کی عمر کو پہنچ جائے۔ سورۃ النساء کے شروع میں مذکور ہے کہ جب کوئی بچے یتیم رہ جائیں تو تم ان کے اموال و جائیداد کی حفاظت کرو اور ان کی دیکھ بھال کرتے رہو۔ **حَتَّىَ إِذَا بَلَغُواْ النِّكَاحَ** (4:6)۔ یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اس وقت ان کے اموال و جائیداد ان کے سپرد کر دو۔ (بشرطیکہ وہ فاتر العقل نہ ہوں) یہاں یہ حقیقت بلاشک وشبہ سامنے آ گئی کہ قرآن کی رو سے نکاح کی عمر بلوغت کی عمر ہے۔ بلوغت سے پہلے نکاح ہو نہیں سکتا۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی صراحت فرما دی کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ **لاَ يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُواْ النِّسَاء كَرْهاً** (4:19)۔ یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ یعنی مرد اس عورت سے شادی کرے جو اسے پسند ہو۔ **مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاء** (4:3)۔ لیکن عورت کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ بلوغت سے قبل نہ لڑکے کا نکاح نکاح ہے اور نہ لڑکی کا عقد عقد۔ اور یہ تلاعب بالدین (دین سے مذاق) ہے اور دنیا و آخرت میں رسوائی کا موجب۔ نکاح کے لئے ایجاب وقبول ایک لاینفک شرط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بچہ کا ایجاب وقبول کچھ معنی ہی نہیں رکھتا۔ ''ایجاب وقبول'' کی رسم اب بھی ہمارے ہاں رائج ہے۔ لیکن جس طرح آج کل اس کی مٹی پلید ہو رہی ہے (بالخصوص لڑکیوں کے معاملہ میں) وہ ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں نابالغ تو ایک طرف بالغ لڑکیوں سے بھی کون پوچھتا ہے کہ تمہارا نکاح کہاں کیا جائے۔ منوسمرتی (ہندوؤں کی معاشرت) میں لڑکی کے متعلق لکھا ہے کہ اسے ساری عمر دوسروں کی مرضی کے تابع رہنا ہوگا۔ لڑکی ہے تو ماں باپ کی، بیوی ہے تو مرد کی، بیوہ ہے تو بیٹے کے رحم وکرم پر۔ وہ دنیا میں کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی۔ یہی کچھ ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے شادی کی تو ان کی عمر چھ برس کی تھی۔ اس لئے بچپن کی شادی جائز ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔

بہرحال جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔قرآن کی رو سے بلوغت سے پہلے نکاح ہونہیں سکتا۔اور نکاح کے لئے بہرحال فریقین کی رضامندی ضروری ہے لیکن ہماری بدبختی کہ ہمارے ہاں نکاحِ نابالغ نہ کہ مروج ہی ہے' بلکہ اسے ''عین دین'' سمجھا جاتا ہے۔ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب ہندوستان میں سارداابل پیش ہوا تھا جس کی رو سے نکاح نابالغاں ناجائز قرار دیئے جانے کی تجویز تھی تو اس بل کی مخالفت میں سناتنی ہندوؤں کی ہم نوائی میں مسلمان بھی نہایت شدومد سے شریک ہوئے تھے اور اس انداز سے شریک کہ گویا وہ بل ان کے دین کے کسی بنیادی رکن کو منہدم کر رہا تھا۔ ہمارے ارباب شریعت کبھی کسی مسئلہ پر متفق نہیں ہوئے۔مختلف فرقے' مختلف مسائل میں اپنے اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں اور آپس میں ہمیشہ مصروف جدل و پیکار اور دست وگریباں۔۔۔لیکن یہ ہماری سوختہ بختی کی انتہا تھی کہ سارداابل کی مخالفت میں مسلمانوں کے تمام فرقے متحد اللسان تھے' اور اس باب میں جو وفدِ عظیم وائسرائے کے پاس پہنچا تھا۔اس میں قریب قریب ہر فرقے کے نمائندے موجود تھے۔یہ تمام ارباب شریعت ایک عیسائی حکمران کے حضور یہ کہنے کے لئے جارہے تھے کہ اس ہندو کے بل کو پاس نہ کیا جائے جو نابالغوں کا نکاح ناجائز قرار دے رہا ہے' ان کا وفد یہ کہنے جارہا تھا اور آسمان ان کی اس حرکت پر روتا تھا اور دنیا ہنستی تھی۔افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قریباً پَون صدی گذرنے کے بعد آج بھی صورتِ حال کچھ مختلف نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بشیر احمد عابد' کویت

ایک سدا بہار عالم دین

(محترم پرویزؒ صاحب کی 22۔ ویں برسی کے موقع پر خصوصی نذرانۂ عقیدت)

ہمارے معاشرے میں علماء دین کو ایک بلند مقام حاصل ہے' لیکن حیرت ہے کہ ان کی اکثریت کی پیروی بالعموم اندھی تقلید کی بنا پر کی جاتی ہے۔لوگوں کے نزدیک ان کے عالم دین ہونے کا معیار بڑا سادہ سا ہوتا ہے۔ایک تو یہ کہ ان کی وضع قطع علماء دین جیسی ہونی چاہیے اور دوسرا یہ کہ وہ بنیادی ارکان دین کو پابندی سے ادا کرتے ہوں۔ اس کے علاوہ ان کو دین کی شد بد ہو یا نہ ہو' انہیں اس کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ انہیں غور سے سنتے ہیں اور ان کے فرمودات کو خدا اور اسول ﷺ کا فرمان سمجھ کر پوری عقیدت واحترام سے پیروی کرتے ہیں۔خواہ یہ فرمان خدا اور رسول ﷺ کے خلاف کھلا جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔

بہت کم عالم دین ایسے ہوتے ہیں جنہیں لوگ علم ونظر کے معیار پر پرکھ کر اور تحقیق وتنقید کی کٹھالی میں تپا کر یعنی خوب ٹھوک بجا کر عالم تسلیم کرتے ہوں۔محترم پرویز صاحب کا شمار ایسے نایاب علماء دین میں ہوتا ہے۔ جو نہ تو خود اندھی تقلید کے قائل تھے اور نہ دوسروں کے لیے ایسا پسند کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سماعت' بصارت اور دل و دماغ جیسے خوبصورت ذرائع علم دیئے ہیں تاکہ وہ انہیں بھرپور طور پر استعمال کرے۔قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

(اور یاد رکھو! جس چیز کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو (جس کی خود تحقیق نہ کرلو) اس کے پیچھے مت لگو۔ (ذاتی تحقیق کے معنی یہ ہیں کہ) تم اپنی سماعت و بصارت (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کرو' اور پھر ان معلومات کی بنا پر' اپنے ذہن سے فیصلہ کرو اور اس طرح صحیح نتیجہ پر پہنچو۔ ان میں سے اگر ایک کڑی بھی گم ہوگئی' تو تمہاری تحقیق ناقص رہ جائیگی۔ سوچو کہ اس باب میں تم پر کتنی

بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔(اس لیے کہ خدا نے تمہیں صاحب اختیار وارادہ بنایا ہے' مجبور مشین نہیں بنایا۔ اور اس اختیار کے استعمال کے لیے ذرائع علم وتحقیق عطا کر دیئے ہیں۔ان سے کام نہ لینے والا اپنی ذمہ داری سے جی چراتا ہے)۔ (القرآن 17:36)۔

پرویز صاحب کے شاگردوں میں ہمیں دو طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ ایک تو وہ جو آپ کی ایک آدھ کتاب پڑھ کر یا درس سن کر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ پرویز صاحب کی قرآنی بصیرت انہیں اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ان کی کیفیت ان جنات کی طرح ہو جاتی ہے جنہوں نے نبی اکرم ﷺ سے پہلی بار قرآن سنا تھا' اور وہ جب اپنے قبیلے کی طرف لوٹ کر گئے تو انہیں نہایت جھوم جھوم کر بتانے لگے کہ آج ہم نے ایک عجیب قرآن سنا جو بالکل سیدھے اور واضح راستے کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو پہلے پہل تو یہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ یہ شخص کہہ کیا رہا ہے؟ انہیں پرویز صاحب کی ہر بات اپنے اسلاف کے مسلک کے خلاف نظر آتی ہے۔اور ان کی کیفیت ان لوگوں کی طرح ہوتی ہے جو انبیاء کرام کو سنتے ہی تلملا اٹھتے تھے کہ یہ کیا کہا جا رہا ہے۔ہم نے تو اس سے پہلے اپنے آباواجداد کو یہ کچھ کہتے نہیں سنا!۔ یہ حضرات پرویز صاحب کو اپنی کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور انہیں چت کرنے کا ہر حربہ استعمال کرتے ہیں لیکن پرویز صاحب کی فکر اسقدر واضح اور مدلل ہے کہ آپ پر ان کا کوئی وار کارگر ثابت نہیں ہوتا اور انہیں بالآخر آپ کی فکر سلیم کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

پرویز صاحب ایک درویش صفت انسان تھے۔ ہر طمع اور خوف سے مبرا قرآن کریم کی سیرت وکردار کا اعلیٰ نمونہ اور علم کا ایک بحر بیکراں۔آپ نے زندگی کا معتد بہ حصہ قرآن کریم کی لازوال بصیرت حاصل کرنے میں بسر کیا۔علماء دین کو اکثر طول طویل اور بھاری بھرکم القابات و خطابات سے نوازا جاتا ہے' مثلاً۔ استاذ الاساتذہ' شیخ المحدثیں امام العصر حضرت مولانا وغیرہ۔لیکن میں نے پرویز صاحب کے لئے....ایک سدا بہار عالم دین کا.....عنوان پسند کیا ہے۔اس کی ایک خاص وجہ ہے' وہ یہ کہ کوئی بھی عالم دین ہو' اسے ایک آدھ بار پڑھنے یا سننے کے بعد طبیعت اکتا جاتی ہے۔اس کی بڑی وجہ ان کے ہاں جدت وتازگی کا فقدان ہوتا ہے۔ یہ حضرات سلف صالحین کی اندھی تقلید کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا علم خشک اور محدود ہوتا ہے۔سلف صالحین نے جو کہا جو لکھا اسے حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔اس کور مغزی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم کی نشوارتقاء رک جاتی ہے۔سوچ وفکر کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور افکار تازہ کی نمود ختم ہو جاتی ہے۔دوسرا یہ کہ ان علماء کے نزدیک کائنات کے حسن و جمال اور رنگ و بو کی کوئی اہمیت نہیں

ہوتی۔ان کی نگاہ صرف اخروی زندگی پر مرکوز ہوتی ہے۔ اقبالؒ نے اس کیفیت کو کیا خوبصورت انداز میں بیاں کیا ہے:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی' نہ محبت' نہ معرفت' نہ نگاہ

یہ اندازِ فکر انسان کی افتادِ طبع اور ذوق لطیف کے بالکل برعکس ہے۔ انسان زیادہ دیر تک اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اخروی زندگی پر ہمارا پختہ ایمان ہے۔ وہاں کی شادابیاں اور رنگینیاں برحق لیکن ہم اس کائنات کے حسن و جمال کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قدر خوبصورت کائنات بنائی اور انسان کو رنگ و بو کی تمیز عطا فرمائی۔اس کے رنگ برنگے نظاروں' مہکتی فضاؤں' معطر ہواؤں اور مدھر سروں سے لطف اندوز نہ ہونا کفرانِ نعمت ہوگا۔ان سے انسان کے ذوقِ لطیف کو جلا ملتی ہے۔محنت و مشقت سے بھری زندگی کو سکون ملتا ہے' اور زندگی ہر روز ایک نئی انگڑائی لے کر اٹھتی ہے۔لیکن پرویز صاحب کے ہاں یہ فکری بانجھ پن' خشکی اور ویرانی نہیں پائی جاتی۔ مجھے ایک طویل عرصہ ہوا ہے پرویز صاحب کو پڑھتے اور سنتے لیکن کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ جب بھی آپ کو پڑھتا یا سنتا ہوں ہر بار کوئی نہ کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے۔ ذہن میں سوچ کی کوئی نئی لہر اٹھتی ہے۔نگاہ میں فکر کی کوئی نئی کلی چٹکتی ہے۔ بار بار سننے کے باوجود ہر بار یوں لگتا ہے کہ جیسے پہلی بار سنا ہے۔ پرویز صاحب کے ہاں ہمیں جو قرآنی بصیرت ملتی ہے اس میں ایک فکری تحرک پایا جاتا ہے۔اس میں جدت ہے' تنوع ہے اور یہ ایک بہت بڑی صفت ہے جو انسان کو ہر دور کے مسائل سے نبرآزما ہونے کے قابل بناتی ہے۔

ہمارے ہاں' گذشتہ ڈیڑھ ہزار برس کے دوران اسلام سے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو اہرام مصر بھی اس ڈھیر کے سامنے پست نظر آئیں' لیکن دیدۂ عبرت اس حرماں نصیبی پر جسقدر بھی آنسو بہائے کم ہے کہ اسے اس آسماں بوس انبار میں قرآن خالص کے متعلق جو کچھ ملے گا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔کاش کہ ان حضرات نے اپنی کاوش کا ایک چوتھائی بھی اس سمت صرف کیا ہوتا تو آج امت مسلمہ جس مقام پر کھڑی ہے اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع اور باعزت مقام پر کھڑی نظر آتی۔ قرآن خالص کے متعلق کسی نے کوئی مفید کام کیا ہی نہیں۔کیا ہوگا لیکن قدامت پرست طبقے نے اسے باقی نہیں رہنے دیا کہ ان کی انتہائی کوشش یہی رہی ہے کہ قرآن کریم امت کی نگاہوں سے اوجھل رہے' کیونکہ اس کی تعلیمات کے بے نقاب اور عام ہو جانے سے ان کے مفادات پر زد پڑتی تھی۔

مذہب کی دنیا بھی ایک عجیب طلسماتی دنیا ہوتی ہے۔اس میں لوگ عقل وفکر کو کم استعمال کرتے ہیں۔جن

عقاید و رسومات پر ان کا ایمان ہوتا ہے ان سے متعلق ان کے ہاں کوئی علمی یا عقلی دلیل نہیں ہوتی بلکہ وہ ان پر اس لئے عمل پیرا ہوتے ہیں کہ ایسا ان کے سلف صالحین کیا کرتے تھے۔ 'سلف صالحین' کے نقوش پا پر قدم رکھ کر چلنے کو حق سمجھا جاتا ہے۔ یا پھر 'سبیل المومنین' کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اردگرد میں لوگ یہی کچھ کر رہے ہیں' تو وہ بھی وہی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ جب مذہب ہی عقل وفکر سے سمجھا نہیں جا سکتا تو پھر مذہبی علماء بھی عقل وفکر کو کم ہی استعمال کرتے ہیں۔ انہیں عالم کہنے کی بجائے منشی کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا' کیونکہ اس طرح ان کو سمجھنے میں آسانی رہتی ہے۔ ایک منشی کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھے یا سنے اسے بعینہ ہی ریکارڈ کر لے۔ وہ یوں نہیں کرتا کہ جو کچھ دیکھا سنا اس پر غور وفکر کے بعد اپنی رائے دی۔ قرآن کریم نے علماء دین کیلئے جو معیار مقرر کیا ہے ہمارے علماء اس کے پاس پاس تو کیا دور دور بھی نہیں۔ قرآن کریم کے نزدیک جو لوگ زندگی کے ہر گوشے میں اللہ اور اس کے قوانین کو مدنظر رکھتے ہیں' اور تخلیق ارض وسماء پر غور وفکر کرتے ہیں' درحقیقت یہ ہوتے ہیں صحیح علماء۔ قرآن انہیں 'اولو الباب' یعنی صاحبان عقل و بصیرت کہتا ہے۔ ہمارے علماء دین میں اس طرح سے غور وفکر کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی' کیونکہ دین کے معاملات میں انہیں آزادانہ سوچ رکھنے کی اجازت ہی نہیں ۔ جو کچھ سلف صالحین سے ہوتا چلا آ رہا ہوتا ہے اسے یہ من وعن پیش کر دیتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ روش پختہ ہو کر ایمان کا حصہ بن جاتی ہے۔ اور پھر اس روش سے کوئی ذرہ بھر بھی ہٹ کر چلے تو اسے محرف دین کہا جاتا ہے۔ پرویز صاحب پر قدامت پرست علماء کا ایک شدید اعتراض یہ بھی ہے کہ آپ نے دین میں تحریف کی ہے' یعنی آپ نے سلف صالحین کی روش کو اختیار نہیں کیا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ الزام کہاں تک درست ہے۔

اسلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک بہترین ضابطہ حیات ہے۔ اس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظم وضبط کو قائم کرنے کیلئے نہایت اہم اصول و قوانین دیے گئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک بہترین مذہب ہے' جبکہ یہ دو متضاد باتیں ہیں۔ مذہب اور ضابطہ حیات کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے' بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ مذہب کی اپنی دنیا ہوتی ہے' اپنے تقاضے ہوتے ہیں' اور انہیں بروئے کار لانے کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک ضابطہ حیات کے اپنے اہداف' اپنے قوانین' اور اپنی اسٹریٹجی ہوتی ہے۔ ضابطہ حیات 'کل' زندگی کو محیط ہوتا ہے جبکہ مذہب زندگی کا 'ایک جزو' ہوتا ہے۔ لہٰذا 'جزو' ایک 'کل' کے برابر نہیں ہوسکتا۔ مذہب عقل کو اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دیتا جبکہ ایک ضابطہ حیات عقل کے بغیر ایک قدم

نہیں چل سکتا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دنیا میں کوئی مذہب ضابطہ حیات نہیں کہلا سکتا اور نہ ہی کوئی ضابطہ حیات مذہب کی جگہ لے سکتا ہے۔ یہ ایک کھلا تضاد ہے اور جس معاشرے میں بھی یہ تضاد پایا جائیگا وہ کبھی متوازن اور مستحکم معاشرہ نہیں بن سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن اقوام نے اس تضاد کو شروع میں بھانپ لیا اور اس کا قلع قمع کر دیا' آج وہ نہایت کامیاب ہیں بہ نسبت ان اقوام کے جو ابھی تک اس تضاد میں الجھی ہیں۔ مغربی اقوام ایک عرصہ تک چرچ اور اسٹیٹ کی وحدت پر قائم رہیں۔ ان کی زندگی کا یہ دور 'ازمنہ مظلمہ' یعنی سیاہ دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں وہ ترقی کے میدان میں ایک قدم نہیں بڑھا سکیں۔ لیکن جونہی اسٹیٹ اور چرچ کو الگ الگ کیا' زندگی کے ہر شعبہ میں دن دگنی اور رات چگنی ترقی کی۔ نہ اسٹیٹ چرچ کے معاملات پر اثرانداز ہوتی ہے اور نہ چرچ اسٹیٹ کے معاملات میں دخل اندازی کرتا ہے۔ لیکن اسلام اس کشمکش سے ابھی تک آزاد نہیں ہوا۔ یہاں حکمرانوں اور علماء دین کے درمیان مضبوط رفاقت قائم ہے۔ حکمران اپنے جبر و استبداد' معاشی ناانصافیوں' اور کمینی حرکتوں کی سند علماء دین سے لیتے ہیں اور حکمران ان کے اس جھوٹ اور افترا کے عوض انہیں نہ صرف تحفظ فراہم کرتے ہیں بلکہ انعام و اکرام سے بھی نوازتے ہیں۔

حکمرانوں اور علماء دین کے مابین اس غیر فطری گٹھ جوڑ کے معاشرتی ترقی پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ معاشرہ اس وقت ترقی کرتا ہے جب حکمران صحیح پالیسیاں وضع کریں اور انہیں خوش اسلوبی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچائیں۔ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں احسن طور پر سرانجام دیں اور بدعنوانیوں کا خاتمہ کریں۔ اس سلسلے میں ان سے اگر کوئی کوتاہی یا غفلت ہو تو ان کا کڑا احتساب کیا جائے۔ لیکن علماء دین ان کی ہر برائی اور بدمعاشی کو نوشتہ تقدیر اور مشیت ایزدی قرار دیکر انہیں عوام کی گرفت سے بچا لیتے ہیں۔ عوام کو صبر و شکر کی میٹھی گولیاں کھلا کر اور آخرت میں جنت کی نویدیں سنا سنا کر سلائے رکھتے ہیں۔ معاشرتی ترقی کا دوسرا اہم گوشہ آزادی فکر و عمل ہوتا ہے۔ اس کی اجازت نہ تو علماء دین اور نہ ہی بدکردار حکمران دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں کیلئے زہر ہلاہل ہے۔ اس میں ان کی بقا کا سوال ہے۔ ایک آزاد جمہوری معاشرے میں نہ تو بدکردار حکمران پنپ سکتے ہیں اور نہ علماء دین کی جہالت فروغ پا سکتی ہے۔ آزاد جمہوری معاشرے میں عوامی گرفت اور احتساب اسقدر قوی اور مضبوط ہوتا ہے کہ اس میں نہ تو کوئی غلط کردار اور نہ کوئی غلط نظریہ قدم جما سکتا ہے۔ آزادی فکر و عمل ایک ایسی قوت ہے جو ہر بیکار اور بے مقصد شئے کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتی ہے۔ اور وہ اشیاء جو انسانیت کیلئے منفعت بخش ہوں ابھر کر اور نکھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ اور یوں معاشرہ شاداں و

فرحاں ترقی وخوشحالی کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔

انسانی معاشرے میں مذہب کا کردار ہمیشہ منفی رہا ہے۔ یہ بظاہر خیر و فلاح کا داعی اور امن و سلامتی کا فرستادہ بن کر سامنے آتا ہے لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھیں تو نظر آئیگا کہ معاشرے میں ہر برائی اور ہر ظلم کے پیچھے کسی نہ کسی شکل میں مذہب کی تائید وترغیب کارفرما ہوتی ہے۔قرآن کریم نے مذہب کیلئے 'سحر' کا لفظ استعمال کیا ہے' کیونکہ یہ سراسر جھوٹ ہوتا ہے۔عربی زبان میں جھوٹ کیلئے 'کذب' کا لفظ بھی موجود ہے لیکن سحر ایک ایسا جھوٹ ہوتا ہے جو بظاہر سچ نظر آتا ہے اور لوگ دھوکہ کھا کر اس کی عقیدت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ انسانوں کا خودتراشیدہ ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے شروع سے انسانوں کی رہ نمائی کے لئے دین نازل کیا ہے۔ دین کے اصل معنی ہیں ایک مربوط نظام جس میں کوئی شے اپنی تخلیق سے لیکر اپنے انجام تک چند مخصوص قوانین کے تابع رہتی ہے : جیسے نظام ارض و سماء۔ نظام فطرت انسان۔ نظام مملکت وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین دین' دین اسلام ہے۔ کیونکہ یہ وہ نظام ہے جو کائنات کے تمام نظاموں کو محیط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انسانوں کے لئے بطور ضابطہ حیات پسند فرمایا ہے۔یعنی انسان اپنی تخلیق کے مقاصد صرف قوانین خداوندی کا اتباع کر کے حاصل کرسکتا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ اسلام ایک دین ہے' مذہب نہیں۔قرآن اس کا آئین ہے اور مسجد اس کی پارلیمنٹ اور اس میں امور مملکت کو چلانے کے لیے فیصلے عوام کے منتخب نمایندوں کی باہمی مشاورت سے ہوتے ہیں اس میں مذہب کب اور کیوں داخل ہوا یہ ایک الگ داستان ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اسے کیسے نکالا جائے؟ مذہبی پیشوائیت معاشرے کی جڑوں میں گھسی ہوئی ہے اور معاشرہ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ جو علماء دین اس صورت احوال کی اصلاح چاہتے ہیں انہیں تحریف دین کا مرتکب قرار دیکر عوامی غیض وغضب کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پرویز صاحب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کا قصور فقط یہ تھا کہ انہوں نے دین اور مذہب کے فرق کو واضح کیا۔قرآن کریم کو اس کے حقیقی مقام بلند پر فائز کیا۔ اسے آئین مملکت اور ضابطہ حیات کے طور پر پیش کیا اور اس کی تعبیر وتشریح بھی اسی نقطہ نظر سے فرمائی۔

جو علماء دین اسلام کو مذہب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' انہیں قرآن کریم کی یہ تعبیر وتشریح عجیب معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس پر کڑی تنقید کرتے ہیں' بلکہ بعض تو اسے دین میں بدترین تحریف قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ قرآن جسے یہ ضابطہ حیات کہتے ہیں اس میں مذہب کا کیا کام؟ مثال کے طور پر' آپ کو آئین پاکستان پڑھنے کے لیے دیا جاتا ہے۔آئین پاکستان میں مملکت کے قیام کی

غرض و غایت' حکمرانی کے اصول وقواعد' حکمرانوں اور عوام کے باہمی حقوق وفرائض کا تعین' ترقی وخوشحالی کے نشان راہ' اور اقوام عالم کے ساتھ باہمی روابط اور عہد و پیمان کے اصول درج ہوتے ہیں۔ اب اگر آپ اسے کھولیں اور پڑھیں اور اس میں لکھے ہوں پرانے زمانے کے قصے کہانیاں' مذہبی عقاید ورسومات' انبیاء کے معجزات وکرامات' اور آخرت میں بخشش ونجات کے لئے وردودعائیں' تو کیا آپ کو تعجب نہیں ہوگا؟ یقیناً ہوگا۔۔! آپ اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں گے' یہ سوچ کر کہ شاید کسی نے عنوان غلط رکھ دیا ہے۔ یہ آئین پاکستان نہیں ہوسکتا۔ یا پھر دوسری صورت یہ ہوگی (اگر آپ کو یقین ہے کہ یہ آئین پاکستان ہی ہے) کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں گے' یہ سوچ کر کہ کہیں اس کی غلط تشریح تو نہیں ہوئی؟ پرویز صاحب نے یہی کچھ کیا' آیئے یہ داستان ان کے اپنے الفاظ میں سنتے ہیں۔

۔۔۔میں نے مروجہ اسلام کے نظریات' تصورات' معتقدات' رسوم ومناسک پر امکان بھر تحقیق کی جس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ ان کا بیشتر حصہ ہم نے دوسروں سے مستعار لیا ہوا ہے۔ میں نے کئی برس تحقیق وکاوش کی' ان سنگلاخ زمینوں اور خارزار وادیوں میں گزارے' اور اس حقیقت کے اعتراف میں مجھے کوئی باک نہیں کہ اس صحرا نوردی اور دشت پیمائی میں میرے شکوک وشبہات بڑھتے چلے گئے اور سابقہ معتقدات وتصورات پر میرا یقین باقی نہ رہا۔ انہیں تو میں نے آسانی سے جھٹک دیا تھا' لیکن اس دستبرد میں ایک چیز ایسی تھی جس کی طرف اس قسم کے شبہات کے ساتھ آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا تھا' اور وہ تھا قرآن کریم۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس قدامت پرستانہ انداز سے میں نے قرآن مجید پڑھا اور سنا تھا' اس کی رو سے (بصد ہزار بار توبہ) اسے خدا کی کتاب سمجھنا تو درکنار' کسی اچھے مصنف کی تصنیف تسلیم کرنا بھی دشوار تھا۔ لیکن' بایں ہمہ میں اسے' دیگر معتقدات کی طرح یونہی جھٹک نہیں دینا چاہتا تھا۔ اور اس کی خاص وجہ تھی۔ سیرت نبوی ﷺ کے وسیع وعمیق مطالعہ کے بعد' حضور ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ مجھے علیٰ وجہ البصیرت والہانہ عقیدت حاصل ہوگئی تھی۔ میرا ایمان تھا کہ ایسی عظیم ہستی جس نے عالم انسانیت میں ایسا تحیر انگیز اور عدیم النظیر انقلاب برپا کر دیا تھا' نہ تو (معاذ اللہ) فریب خوردہ ہوسکتی ہے' اور نہ ہی (پناہ بخدا) فریب کار۔ اس لئے جب اس ذات گرامی ﷺ نے بتایا ہے کہ قرآن مجید' نہ میری اور نہ کسی اور انسان کی فکری تخلیق ہے' یہ خدا کا کلام ہے' تو مجھے توقف کرنا چاہئے تا آنکہ اس کے صحیح طور پر سمجھنے کا طریق معلوم ہو جائے۔ اور مبداء

فیض کی کرم گستری سے یہ طریق جلد ہی سامنے آ گیا۔

پرویز صاحب نے فہم قرآن کے لیے کیا طریق اختیار کیا' اسے تو ذرا آگے چل کر بیان کیا جائیگا۔ فی الحال یہ دیکھئے کہ قرآن فہمی کے روایتی طریق میں کیا خامیاں اور نقائص ہیں اور ان سے ملت اسلامیہ کو کیا کیا نقصانات پہنچے ہیں۔ فہم قرآن کے روایتی طریق میں احادیث' تاریخ' فقہ' اور اجماع امت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن ان کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس طریق میں بنیادی خامی یہ ہے کہ یہ تمام تر لٹریچر نبی اکرم ﷺ کی وفات کے اڑھائی تین سو سال بعد غیر مستند ذرائع سے وجود میں آیا۔ اس کے ظنی ہونے میں کسی کو شبہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس سے قرآن کریم کی وسعت اور ہمہ گیری بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ قرآن جس کا واحد مقصد ہر دور کے انسان کی راہ نمائی کرنی تھی وہ چند ایک مخصوص حالات و واقعات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اگر ویسے بھی دیکھا جائے۔ احادیث' تاریخ' فقہ وغیرہ تو انسانی عقل کی پیداوار ہیں۔ اصولاً انسانی عقل کو تو قرآن کے تابع رہنا چاہئے' لیکن ہوا اس کے الٹ۔ علماء دین نے احادیث' تاریخ' اور فقہ کو اسقدر اہمیت دی کہ قرآن ان کے تابع ہو گیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جو کچھ ان کتب میں آیا ہے' خواہ وہ قرآن میں ہے یا نہیں' عمل اس پر کیا جائیگا۔ مثلاً رجم کی سزا کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں لیکن اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ وصیت کو قرآن نے بلا شرط فرض قرار دیا ہے لیکن اس پر عمل مشروط کر دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اصحاب رسول ﷺ آپس میں ابریشم کی طرح نرم اور دشمن کے خلاف سیسہ پلائی دیوار تھے' لیکن تاریخ و احادیث کی کتابیں بتاتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اقتدار کی کشمکش اور ہوس میں ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچتے اور گردنیں اڑاتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ اپنی زاید از ضرورت کمائی غریبوں میں تقسیم کر دو۔ احادیث کہتی ہیں کہ سال بھر میں صرف ایک بار اڑھائی فیصد نکال کر غریبوں میں تقسیم کر دو۔ تمہارا فریضہ ادا ہو گیا۔ اس طرح کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن ہم انہی چند ایک پر اکتفا کریں گے۔ ہمارا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ قرآن مہجور ہو گیا۔ اس کی فطری وسعت' ہمہ گیری' تحرک اور تنوع جو اسے ہر دور کے مسائل سے نبٹنے کی صلاحیت دیتا ہے' وہ ختم ہو گیا۔

قانون کا مقصد انسانی معاملات میں آسانیاں پیدا کرنا اور کاوٹوں کو دور کر کے معاشرے کو ترقی کی راہ پر رواں دواں رکھنا ہوتا ہے۔ اگر اس میں یہ صلاحیت مفقود ہو جائے تو پھر وہ اندھا قانون بن جاتا ہے۔ وہ قانون برائے قانون ہوتا ہے' نہ کہ قانون برائے اصلاح یا فلاح! قرآن کریم کے اردگرد حصاروں نے اس کی افادیت کو ختم کر دیا اور اس پر ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری قائم کر کے باقی

اہل فکر و دانش اور عامتہ الناس کو اس عظیم سرچشمہ نور و ہدایت کی ضیا پاشیوں اور فیض یابیوں سے محروم کر دیا۔ اسلام میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ دینی معاملات اور دنیاوی معاملات الگ الگ طے پانے لگے اور امت ایک زبردست فکری انتشار کا شکار ہوگئی۔ امت میں یکجہتی باقی نہ رہی اور اس کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ قرآن کریم ایک صالح اور محکم نظام لے کر آیا تھا جس میں اقوام عالم کیلئے حیات بخش پیغام تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں' ایک صالح اور محکم نظام زندگی شجر طیب کی طرح ہوتا ہے جس کی جڑیں پاتال میں مضبوطی سے گڑی اور آفاق میں دور دور تک پھیلی ہوتی ہیں اور اس پر ہر موسم میں پھل آتے ہیں۔ یعنی ایک صالح نظام مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور اس کے ثمرات سے ساری دنیا مستفید ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک بودا نظام ہوتا ہے جو شجر خبیث کی طرح کھوکھلی بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے اور اسے ہر وقت گرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس میں قرار وسکوں نہیں ہوتا۔ جب سے قرآن کریم کی خالص تعلیمات نگاہوں سے اوجھل ہوئیں' باقی دنیا کو تو چھوڑیئے' خود اسلامی معاشروں میں استحکام اور امن و سلامتی باقی نہیں رہی۔ کعبہ جو کہ اس نظام کا محسوس نشان ہے' اللہ تعالیٰ نے اسے پوری انسانیت کیلئے ثبات اور امن کا مرکز قرار دیا ہے۔ لیکن اب وہ نظام ہی باقی نہیں رہا تو مرکز کیا کرے۔ قرآن موجود ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ لوگ اس کی تلاوت کرتے ہیں لیکن اس پر غور وفکر نہیں کرتے۔ اسے بطور ایک مذہبی کتاب کے استعمال کیا جاتا ہے لیکن آئین مملکت نہیں مانا جاتا۔ اس کی آئینی اور قانونی حیثیت تو مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ پرویز صاحب نے قرآن فہمی کا کیا طریق اختیار کیا ہے۔ روایتی علماء دین نے ان پر شدید اعتراضات کیے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے کوئی نیا طریقہ نہیں وضع کیا۔ علم حاصل کرنے کے معروف اور مسلمہ طریق پر ہی عمل کیا ہے۔ ہاں البتہ یہ ضرور کیا ہے کہ پہلے آپ نے قرآن کریم کا صحیح مقام متعین کیا ہے۔ آپ نے اسے مذہبی کتاب کی حیثیت سے نہیں بلکہ انسانی ضابطہ حیات کے طور پر سمجھا ہے۔ اس سے یہ فرق پڑا کہ علماء دین نے جن قرآنی الفاظ اور اصطلاحات کے معانی مذہب کی رو سے لیے ہیں' پرویز صاحب نے ان کے معانی آئینی اور قانونی نقطہ نظر سے لیے ہیں۔ مثال کے طور پر مذہب میں 'الہ' کے معنی معبود ہے یعنی جس کی پرستش کی جائے۔ جبکہ آئین میں 'الہ' کے معنی حکمران ہے' یعنی جس کا حکم مانا جائے۔ اسی طرح 'عبادت' مذہب میں پوجا پاٹ کو کہتے ہیں اور آئین میں محکومیت اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ 'ذکر' اللہ کو یاد کرنا یعنی اس کا نام بار بار دہرانا جبکہ آئین میں 'ذکر' قانون کو کہتے ہیں یعنی جسے ہمہ وقت نگاہوں کے سامنے رہنا چاہیے۔ ان دونوں معانی کی سند عربی زبان اور

قرآن کریم سے مل جاتی ہے لیکن قرآن میں ان الفاظ کو اسلام کے لئے نہیں بلکہ دیگر مذاہب کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔کسی فلاسفر نے سچ کہا ہے کہ اگر الفاظ کے صحیح معنی متعین کر لئے جائیں تو آدھا مسئلہ یونہی حل ہو جاتا ہے۔ بے شک الفاظ کے معانی انسان کی سوچ وفکر اور اعمال وعواقب پر بڑے گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اوپر کی مثال دیکھ لیجئے۔کس طرح معانی کے بدلنے سے دین میں تفریق پیدا ہوئی اور انسانیت کے لئے لاینحل مسائل کھڑے کر دیے گئے۔ پرویز صاحب نے دین کی وحدت کے اصول (توحید) کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ضابطہ حیات کے طور پر سمجھا اور اس کیلئے معروف طریقہ اختیار کیا۔اس طریق کے چند بنیادی نقاط یہ ہیں۔

1- قرآن کریم کو خالی الذہن ہو کر پڑھیں۔اگر ذہن میں دیگر نظریات' معتقدات' تصورات موجود ہوں گے تو قرآن کے معانی سمجھ نہیں آئیں گے۔

2- قرآن اپنے آپ کو نور کہتا ہے' یعنی روشنی۔اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی خارجی ذریعہ کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو خود دکھاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی تمام اشیاء کی اصل وحقیقت کو بھی واضح کر دیتی ہے۔اس لئے یہ کہنا کہ قرآن احادیث یا تاریخ کے بغیر سمجھ نہیں آتا' قرآن کریم کی اس صفت کی نفی کرنے کے مترادف ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کو جو معلم اول کہا جاتا ہے اور ان کا فریضہ کتاب وحکمت کی تعلیم دینا بتایا جاتا ہے وہ ایک الگ بات ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن احادیث کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔قرآن کی یہ صفت کہ یہ نور اور کتاب مبین ہے' ہر دور کے معلم ومتعلم کے لئے مفید اور کارآمد ہے۔قرآن کریم میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ تم اس کتاب میں غور وفکر کرو۔اس سے اس کے حقائق ابھر کر اور نکھر کر سامنے آجائیں گے۔قرآن کریم میں غور وتدبر کا حکم نہ تو خاص افراد کے لئے ہے اور نہ کسی زمانے سے مختص ہے۔ یہ کتاب عظیم تمام انسانوں کے لئے تا قیامت ضابطہ حیات ہے۔اس لئے اس پر غور وفکر کرنا' اس پر ایمان رکھنے والوں کا فریضہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔

''ہم نوع انسان کو انفس وآفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے' تا آنکہ یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ مبنی بر حقیقت ہے۔''

اب ظاہر ہے کہ انفس وآفاق کے حقائق تو حدود ناآشنا ہیں۔علم انسانی جوں جوں وسیع' عمیق' اور بلند ہوتا جائے گا' زمانے کی لہروں میں لپٹے ہوئے حقائق بے نقاب ہوتے' اور اس طرح نت نئے عنوانات سامنے آتے جائیں گے۔قرآنی علوم کی پنہائیوں کا یہ عالم ہے کہ زمین سے لے کر فلک تک کائنات کی ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اس باب میں حرف آخر' دنیا کے آخری انسان کے لئے چھوڑنا پڑے گا۔

3- قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔اس لئے اسے صحیح طور پر سمجھنے کے لئے 'محاورہ عرب' پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔محاورہ عرب سے مراد یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ قرآن کریم میں جو الفاظ آئے ہیں، زمانہ نزول قرآن میں عرب اس کا کیا مفہوم سمجھتے تھے۔اس سلسلے میں کسی دوسرے کے قول وفہم پر بھروسہ نہ کیا جائے' نہ اس پر اکتفا کرے۔اس لئے کہ بہت سے الفاظ زمانہ نزول قرآن میں کسی خاص مطلب ومعنی کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ بعد میں تھوڑا یا زیادہ عرصہ گزرنے پر ان کے دوسرے معنی لئے جانے لگے۔مثلاً لفظ 'تاویل' ہے' جو تفسیر کے معنوں میں مشہور ہوگیا۔لیکن قرآن میں یہ لفظ دوسرے معنوں میں آیا ہے۔یعنی انجام کار' عاقبت' قرآن کے وعدہ وعید کا نتیجہ ظاہر ہونا۔قرآن پر غور کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے الفاظ کے وہی معنی لیں جو زمانہ نزول قرآن میں لئے جاتے تھے۔اس ضمن میں بہترین طریق یہ ہے کہ الفاظ کے معنی کے تعین میں خود قرآن سے مدد لے اور مکرر آنے والے الفاظ کا قرآن میں مطالعہ کرے۔بعض اوقات وہ دیکھے گا کہ ایک ہی لفظ متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے' مثلاً ''امت'' 'عبادت' وغیرہ۔ ان مقامات پر غور وفکر کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ فلاں مقام پر اس کے صحیح معنی کیا ہیں۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ ''القرآن یفسر بعضه بعضا''.. قرآن کا ایک مقام دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔اس طرح کسی لفظ کے خاص معنی کو ترجیح دینے کے لیے اصول یہ ہوگا کہ وہ معنی سابقہ عبارت سے مطابقت رکھتے ہوں' پورے موضوع و مطالب سے مطابقت رکھتے ہوں' اور قرآن کے 'کلی' مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔

4- قرآن فہمی کا چوتھا بنیادی نقطہ 'تصریف آیات' ہے۔قرآن کریم کا انداز بیاں عام تصانیف کی طرح نہیں ہے۔عام تصانیف میں کتاب کو مختلف موضوعات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔اور جس موضوع پر جو کہنا ہوا سے متعلقہ باب میں بیان کر دیا جاتا ہے۔لیکن قرآن کریم کا یہ اسلوب نہیں ہے۔اس میں ایک حقیقت اگر ایک مقام پر بیان کی گئی ہے تو اس کی مزید وضاحت یا تفصیل دوسرے مقام پر آئی ہے۔ پھر اہم حقائق کو مختلف مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ یہ انداز کسقدر بلیغ اور حقائق کی وضاحت کے لئے کسقدر موثر ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ یہاں صرف اتنا بتانا ہے کہ قرآن کریم کا یہ اسلوب بیاں۔تصریف آیات کہلاتا ہے۔یعنی آیات کو پھیر پھیر کر سامنے لانا۔سورہ انعام میں ہے۔ 'وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ'(6:105).. اس طرح ہم اپنے قوانین وحقائق کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں اور دہرا دہرا کر ان کی وضاحت کرتے ہیں تاکہ علم و بصیرت سے کام لینے والوں کے لئے بات سمجھنا آسان ہو

جائے۔

پرویز صاحب نے اس طریق کے مطابق قرآن کریم کو سمجھا۔ اس کی مثال نہ سلف میں اور نہ موجودہ دور کے علماء کے ہاں ملتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو بہت محنت کرنی پڑی۔ سب سے پہلے آپ نے لغات القرآن مرتب کی۔ اس کے لئے آپ نے عربی زبان کی مستند لغات اور کلاسیکی ادب سے استفادہ کیا۔ فہم قرآن کیلئے یہ لغات اپنی مثال آپ ہے۔ آپ پر شدید تنقید کرنے والے علماء بھی اس کی افادیت سے انکار نہیں کرتے۔ دوسری کتاب 'تبویب القرآن' ہے جس میں تصریف آیات کی رو سے مختلف موضوعات پر قرآنی آیات کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں کی روشنی میں آپ نے 'مفہوم القرآن' لکھا ہے۔ یہ ایک شاہکار تصنیف ہے۔ اس میں قرآن کریم کے حقائق شفاف موتیوں کی طرح نکھر کر نگاہوں میں سما جاتے ہیں اور ان کو سمجھنے میں کوئی ابہام پیدا نہیں ہوتا' کوئی تضاد باقی نہیں رہتا۔ پرویز صاحب نے قرآن فہمی کیلئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی۔ لیکن اس کیلئے نہ مال و دولت کی لالچ کی اور نہ ہی جاہ و منصب کی تمنا! آپ نے اتنا وسیع لٹریچر تخلیق کیا ہے جس کی مثال پاکستان میں تو قطعاً نہیں اور عالم اسلام میں شاید ہی کسی دوسرے عالم دین کے ہاں ملتی ہو۔ اس کے باوجود آپ نے کبھی غرور و تکبر نہیں کیا۔ آپ ہمیشہ اپنے آپ کو قرآن کا ایک ادنیٰ طالبعلم کہتے تھے' اور کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میری بات حرف آخر ہے۔ اس حقیقت کا اظہار آپ نے ہر تصنیف میں کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''آخر میں' اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ جو کچھ مفہوم القرآن میں پیش کیا گیا ہے وہ فہم قرآن کی انسانی کوشش ہے' اور انسانی کوشش کبھی سہو و خطا سے منزہ نہیں ہوسکتی۔ نہ ہی اسے حرف آخر کہا جا سکتا ہے۔ میں نے قرآن فہمی کے سلسلے میں اپنی بصیرت کے مطابق ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ اگر میری یہ کوشش نتیجہ خیز ہوئی' تو مجھ سے بہتر صلاحیتیں رکھنے والے اسے واضح سے واضح تر کرتے جائیں گے۔ اور یوں یہ سلسلہ قانونِ کائنات کے مطابق اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائیگا۔ قرآن فہمی کا سلسلہ نہ کسی دور میں ختم ہوسکتا ہے' نہ کسی انسان تک پہنچ کر رک سکتا ہے۔ یہ ایک جوئے رواں ہے جو لا متناہی وسعتوں کا امکان رکھتی ہے۔ جوں جوں انسانی علم وسیع ہو گا قرآنی حقائق بیش از بیش بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔ حتیٰ هي مطلع الفجر. (تا آنکہ انسانیت کے خزاں گزیدہ چمن میں صبح نو بہار طلوع نہیں ہو جاتی)۔'' یہ ہے پرویز۔۔قرآنی بصیرت کا مینارہ نور۔۔ایک متبحر عالم دین۔۔ایک مخلص معلم۔۔ایک عظیم انسان!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

مسلمانوں کے باہمی اختلافات کا اصل سبب

ٹی۔وی کے ایک مشہور چینل کے پروگرام میں اسلام کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی تو ایک معروف پروفیسر صاحب نے یہ فرمایا کہ ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام بہت خوبیوں کا مذہب ہے، لیکن دقت اور پریشانی اس وقت واقع ہوتی ہے جب اسلام کی کوئی واضح اور متفق علیہ تعبیر نہیں ملتی۔ ہر فرقہ اور ہر سیاسی پارٹی خود کو صحیح اسلام کی نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور دوسرے فرقے یا دوسری سیاسی پارٹی کو اسلام سے خارج یا کم سے کم اسلام کا صحیح متبع نہیں سمجھتی۔ قارئینِ کرام کو خود بھی اندازہ ہوگا کہ یہ اعتراض کوئی نیا نہیں ہے۔ ہم خود اپنی عملی زندگی میں روزانہ اس اعتراض سے دوچار ہوتے ہیں اور خود مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہر فرقہ اور ہر سیاسی پارٹی اپنے مسلک کی صحت پر اس درجہ اصرار کرتی ہے کہ اس سے ایک انچ سرکنے کو تیار نہیں اور دوسروں کو گمراہ قرار دینے میں کوئی رعایت اور لچک ظاہر نہیں کرتا۔ بظاہر اس وقت ہمارے پاس کوئی ایسا طریقہ بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کو درست اور کسی کو غلط قرار دے دیں۔

یہ بات واقعاً غور کرنے کے قابل ہے کہ آخر ہم مسلمانوں کی یہ صورتِ حال کیوں ہے کہ کسی اختلاف کا حل ہی نہیں ملتا۔ ہمارے ہاں صدرِ اول سے آج تک شیعہ وسنی کی نزاع چلی آ رہی ہے۔ حال ہی میں گذشتہ صدی میں احمدی مرزائی فرقہ کے متعلق بہت بحث وتمحیص چلتی رہی۔ پاکستان کی تشکیل کے فوری بعد دیوبندی، بریلوی مسالک کے درمیان اختلافات کی آگ کو ہوا دی گئی۔ دونوں فرقے کے علماء کسی تنازع میں بھی کسی متفق علیہ نظریہ پر نہیں پہنچے۔ تشکیل پاکستان سے پیشتر، علماء کی اکثریت قیام پاکستان اور اسلامی حکومت کے تصور کے خلاف تھی یہی علماء کرام یہاں آ کر اسلامی حکومت کے داعی بن گئے۔ اسی طرح سعودی عرب میں اسلام کی اور تعبیر ہے، اور ایران میں اس کی دوسری تعبیر۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اپنی توانائیاں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں صرف ہوتی رہیں، جس کی وجہ سے مسلمان برابر تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔

قرآن کریم نے اس کا ایک واضح حل دیا تھا جس کو ہم نے بالکل قابل توجہ نہیں سمجھا اور اسی وجہ سے اس پریشانی سے دوچار ہوئے۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ

-(42:10)

اور جب تمہارا کسی چیز میں بھی باہم اختلاف ہو، تو اس کا فیصلہ خدا کے حوالہ ہے۔

یعنی اس کا فیصلہ اللہ کی کتاب سے کرا لیا جائے۔ آپ غور فرمائیں

کہ قرآن کا اتنا واضح حکم ہے کہ اس میں کسی تعبیر وتاویل کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔لیکن ہم مسلمانوں نے اس اصول کو بالکل پس پشت ڈال دیا' اور اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں کبھی ایک مرتبہ' کسی ایک مسئلہ میں' قرآن خالص سے فیصلہ نہیں کرایا۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے روایات کو خود ہی وحی قرار دے کر' اس کو قرآن کے ہم پلہ' مثلہٗ معہٗ قرار دیا۔اس کے بعد الہام' کشف' علم لدنی' ان سب ذرائع کو علم خداوندی حاصل کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا۔قرآن کریم' صحت وسقم ماپنے کا واحد ذریعہ اور معیار نہ رہا۔اب صحیح وغلط' کو معلوم کرنے کے کئی ذرائع ہو گئے اور چونکہ ان ذرائع سے حاصل کردہ علم میں خود تضاد وتخالف تھا' اس لئے ان کے ذریعے کسی مسئلہ کا دوٹوک جواب حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔اب موجودہ صورتِ حال سے نکلنے کے دو ہی طریقے ہیں۔آپ ہر فرقہ یا سیاسی پارٹی کو خالص قرآنی معیار پر پرکھیں' ہو نہیں سکتا کہ کسی بھی پارٹی یا فرقہ کی صحت وسقم واضح نہ ہو جائے' اس کے لئے آپ کو روایات (وحی خفی) الہام' علم لدنی کی بالکل تردید کرنی ہوگی۔

دوسرا طریقہ جو اس سے بھی واضح تر ہے کہ آپ اس فرقہ یا پارٹی کے نظریات کے مطابق اسلام کا نظام' (دین) کو عملاً نافذ کر دیں۔اس کے نتائج خود اس کے صحت وسقم کے معیار ہوں گے۔کیونکہ قرآن کریم نے خود یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نظام کے نتائج اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہیں۔فرمایا:

وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ (10:39)-

اس نظام کے نتائج خود اس نظام کے درست ہونے کی دلیل ہوں گے۔

محترم قارئین کرام کے علم میں ہے کہ اس رسالہ کا کسی فرقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ خالص قرآنی فکر اور دین کا داعی ہے۔اس کے نزدیک درست صرف دین ہے۔مذہب کوئی بھی ہو وہ غلط اور خلاف قرآن ہے۔اس کے نزدیک چونکہ شیعہ وسنی دونوں مذہب اور فرقہ ہیں' اس لئے اس کے نزدیک دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔کسی کو کسی پر برتری نہیں۔تاہم یہ رسالہ ان دونوں فرقوں کی عزت کرتا ہے' اور شیعہ حضرات کا احترام اس لئے زیادہ کرتا ہے کہ وہ تعداد میں کم ہیں۔اس لئے کوئی ایسی بات تحریر نہیں کی جاتی جس سے ان کے احساسات کو رنج پہنچے۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں میں صدر اول سے ہی ان دونوں فرقوں میں مناظرے ہوتے چلے آ رہے ہیں' لیکن یہ دونوں فرقے آج تک نہ تو کسی نتیجہ پر پہنچے ہیں اور نہ ہی یہ پہنچ سکتے ہیں کیونکہ یہ حضرات قرآن کریم کو اپنی گفتگو کا مدار محور قرار نہیں دیتے بلکہ ان کتابوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں خود تضاد بیانی موجود ہوتی ہے۔کیونکہ ان کتابوں سے ہر قسم کا مواد مہیا ہو جاتا ہے اور یہی مسلمانوں کو آپس میں لڑاتی ہیں۔اس لئے کوئی واضح نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ہمارے نزدیک ''مناظرہ'' یا احقاق الحق اور ابطال الباطل کا یہ طریقہ ہی غلط ہے۔یہ طریقہ مذہب کا ہوتا ہے۔دین کا یہ طریقہ ہے کہ آپ اس کو عملاً نافذ کر دیں۔اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی صاف سامنے آ جائے گا۔اس کی واضح مثال ایران کا موجودہ انقلاب ہے۔اگر تشیع کا پیش کردہ اسلامی نظام درست ہوتا تو اس کے درخشندہ نتائج قرآن کے وعدوں کے مطابق سامنے آ چکے ہوتے۔ایران کے انقلاب کا کامیاب نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ تشیع کا پیش کردہ نظریہ' نہ صرف یہ کہ درست نہیں ہے بلکہ قابل عمل ہی نہیں ہے۔

حضورﷺ کے انتقال کے بعد حضورﷺ کے جانشین

مقرر کرنے کے بارے میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ حضورﷺ کے قائم کردہ اسلامی نظام کو چلانے کے لئے اپنے میں سے ایک بہترین آدمی کو چن لیا جائے اور وہ شخص امت کے مشورہ سے اس نظام کو جاری رکھے۔ اس گروہ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس عہدہ کے لئے منتخب کر لیا۔ دوسرے محترم گروہ کا خیال تھا کہ اس نظام کو چلانے کے لئے اس کا سربراہ منصوص من اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نظام کو چلانے کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی بدقسمتی کہ وہ اسلامی نظام ہی منقرض ہو گیا لیکن یہ بات شدید حیرانی کی ہے کہ اس طویل عرصہ میں ان دونوں فرقوں نے کبھی دین قائم کرنے کی تو کوئی کوشش نہیں کی لیکن یہ اختلاف کرتے رہے کہ اسلامی نظام کا سربراہ (Head of State) کس طریقہ سے بنایا جانا چاہئے اور اس مفروضہ تنازعہ پر مناظرے اور سر پھٹول کرتے رہے۔ تیرہ سو سال کے بعد شیعہ حضرات کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ انہوں نے ایران میں اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کی لیکن آپ حیران ہوں گے کہ جس بنیادی نکتہ پر انہوں نے جمہور مسلمانوں سے اختلاف کیا تھا کہ سربراہ مملکت' منصوص من اللہ' ہونا چاہئے' اس نکتہ کو چھوڑ کر' انہوں نے جمہور مسلمانوں کے موقف کے مطابق اپنا سربراہ مملکت' انتخاب کے ذریعے خامنہ ای صاحب کو منتخب کر لیا اور اپنے اس بنیادی موقف سے کہ سربراہ مملکت منصوص من اللہ ہو' اس سے انحراف کر گئے۔ کیونکہ اس وقت ایران کا سربراہ منصوص من اللہ لانا' قابل عمل ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تشیعہ کا نقطۂ نگاہ قابل عمل ہی نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تشیع میں اسلامی نظام کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ چونکہ اس رسالہ کی پالیسی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس نکتہ کی وضاحت کی جائے۔ اس لئے اس مسئلہ کو یہاں ہی ختم کیا جاتا ہے۔ یہ مثال صرف اس لئے دی گئی تھی کہ دین کس طرح صحیح اور غلط کو واضح کر دیتا ہے۔ اگر کوئی شیعہ رسالہ اس بات کی وضاحت طلب کرنا چاہے گا' تو اس نکتہ کی وضاحت اور ایرانی انقلاب کے ناکام ہونے کی وجوہات پیش خدمت کر دی جائیں گی۔

اس موجودہ صورت حال سے نکلنے اور مسلمانوں کو پستی و ذلت سے نجات دلانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کی ہدایت کے لئے صرف اور صرف اور محض قرآن کریم ہی عنایت کیا گیا ہے۔ یہی انسانیت کا آخری سہارا ہے۔ یہی ہمارا جنم جنم کا ساتھی ہے۔ یہی ہماری آخری پناہ گاہ: وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَداً (18:27)- (ترجمہ) اور تم اس (قرآن) کے سوا کہیں کوئی پناہ گاہ نہ پا سکو گے۔ اس کے اصولوں اور قوانین پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے اقوام وملل عالم کے موت وحیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جن زنجیروں نے انسانیت کو ظلم وستم اور غیر خداوندی بندشوں میں باندھ رکھا ہے یہ ان تمام زنجیروں کو کاٹ کے رکھ دیتا ہے (7:157)- فکر انسانیت علی العموم اور فکر مغرب علی الخصوص جس مقام تک پہنچا ہے۔ وہ فکر انسانی اس سراج منیر کے سامنے بچوں کا کھلونا معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی اور حرماں نصیبی کہ وہ اس فکر کو انسانیت کی راہ نمائی کے لئے کافی نہیں سمجھتے حالانکہ خود قرآن کریم نے اس کو پوری انسانیت کے لئے ابدالآباد تک کے لئے کافی قرار دیا ہے (29:51)- اس کتاب

کے ہوتے ہوئے' الہام' وحی خفی (روایات) اور علم لدنی کو خدا کی طرف سے عطا کردہ علم شمار کرنا' قرآن کریم کی کفایت سے انکار اور اس کی توہین ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے (15:9) جبکہ الہام' وحی خفی (روایات) اور علم لدنی کی حفاظت وصیانت کی کوئی ذمہ داری کسی پر نہیں ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کے لئے ازبسکہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حاصل شدہ علم صرف قرآن کریم میں محصور و محدود سمجھیں باقی اپنی طرف سے اضافہ کئے ہوئے علوم' وحی خفی' علم لدنی اور الہام کو قرآنی علم قرار نہ دیں۔

جہاں تک روایات کے وحی خفی' یعنی علم خداوندی ہونے کی بات ہے' اس سلسلہ میں کمترین راقم سطور کے آٹھ مضامین طبع ہو چکے ہیں۔ جن میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ روایات وحی نہیں ہیں روایات کے وحی نہ ہونے کے بارے میں بار بار تحریر کرنے سے قارئین کرام کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ روایات کے وحی نہ ہونے کے جو دلائل قرآن سے پیش کئے گئے ہیں وہ ان سابقہ طبع شدہ مضامین سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ چند عقلی دلائل کو تجدید یادداشت کے لئے دوبارہ تحریر کیا جاتا ہے' کیونکہ یہ بہت مختصر بھی ہیں اور مفید بھی۔

(1) پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم جنہیں احادیث کہتے ہیں یہ احادیث نہیں ہیں۔ یہ روایات ہیں۔ یہ اقوال رسول نہیں ہیں بلکہ اقوال منسوب الی الرسول ہیں۔

(2) ان روایات کے بارے میں ہمارے علماء کرام خود اس بات کے قائل ہیں کہ یہ روایات نقل بالمعنی ہوتی ہیں یعنی ان میں حضور کے کسی مفہوم کو راویوں نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے یہ الفاظ راویوں کے اپنے ہیں۔ راویوں کے یہ اپنے الفاظ وحی کیسے ہو سکتے ہیں؟

(3) قرآن تو وحی ہے اور اگر روایات بھی وحی ہیں تو حضورﷺ کی اپنی سوچ اور فکر کے الفاظ و اقوال کون سے ہیں۔ قرآن حضورﷺ کی سوچ اور فکر کی تعریف کرتا ہے' تو یقیناً حضورﷺ اپنی سوچ اور فکر سے بھی کلام فرماتے ہیں تو حضورﷺ کا وہ کلام کونسا ہے؟

(4) وحی سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر احادیث وحی خفی ہیں' تو ان کی اطاعت سے بھی تو اللہ کی اطاعت ہو گی۔ ان کی اطاعت سے رسول اللہﷺ کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وحی کے ایک حصہ سے تو اللہ کی اطاعت ہو اور وحی کے دوسرے حصہ سے رسول کی اطاعت ہو۔

(5) قرآن کریم میں جملہ مومنین کو مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے 12:38' اس عمومی حکم کی موجودگی میں حضورﷺ کو الگ حکم ہوا: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (3:159)۔ کاموں میں مومنین سے مشاورت کر لیا کرو۔ اگر حضورﷺ کے اقوال وحی خفی تھے تو کیا وحی مشورہ کے بعد نازل ہوتی تھی۔ وحی میں تو مشورہ کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

(6) اگر روایات وحی تھیں' تو انہیں بھی قرآن کی طرح محفوظ کرانے کی ذمہ داری حضورﷺ پر تھی۔ وحی کے ایک حصہ کو محفوظ کرنا اور دوسرے حصہ کو راویوں کی صوابدید پر چھوڑ دینا مناسب نہیں تھا۔ اس طرح تو راوی حضرات کارِ رسالت میں شریک قرار پاتے ہیں۔

(7) ہمارے علماء روایات کو وحی خفی قرار دیتے ہیں لیکن قرآن کی رو سے وحی خفی نہیں ہو سکتی کیونکہ حضورﷺ کو حکم تھا:

بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْکَ مِن رَّبِّکَ (5:67)- جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا اس کو پہنچا دو۔ وحی اگر چلتی تلواروں میں بھی نازل ہوتی تھی تو رسول ﷺ کا فرض تھا کہ اس کو فوراً پہنچا دیں۔ وحی خفی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ نام ہی غلط ہے اور خلاف قرآن ہے۔

الہام کی بحث

وحی خفی (روایات) کے علاوہ دوسرا ذریعہ علم خداوندی حاصل ہونے کا الہام کو قرار دیا جاتا ہے۔ الہام کے بارے میں عرض ہے کہ الہام کا لفظ ہی قرآن کریم میں کسی جگہ نہیں آیا جس سے الہام کی سند حاصل کی جاسکتی البتہ اس مادہ سے اَلْھَمَ کا لفظ سورہ شمس میں ایک جگہ آیا ہے جس کا غلط مفہوم لینے سے ہم مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا ہے۔ ہمارے ہاں قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم قرآن کریم کے الفاظ کے اصل Original معانی نہیں لیتے جس معنے میں وہ نزول قرآن کے وقت مستعمل تھے۔ بلکہ ہم ان کو نئے معانی پہنا کر ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کا یہ اصطلاحی مفہوم احادیث اور تصوف کے زیر اثر خود ایسا متعین کرتے ہیں جس کا قرآن کے اصل مفہوم سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر قرآن میں جب وہ لفظ اپنے اصل مفہوم میں آتا ہے، تو ہم فوراً اس کو اپنے اصطلاحی معنے کے لئے بطور سند پیش کر دیتے ہیں اور اس طرح آیۂ کریمہ کا سارا مفہوم اپنا پیدا کردہ ہو جاتا ہے۔ اس کی واضح مثالیں وسیلہ، امام، روح، محراب، توبہ، استغفار، تہجد وغیرہ الفاظ ہیں۔ الہام کے لفظ کے بارے میں بھی بعینہٖ یہی غلطی ہوئی ہے۔ اَلْھَمَ کا لفظ قرآن میں صرف ایک جگہ آیا ہے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (91:8)- اس کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے ''پھر سمجھ دی اس کو ڈھٹائی کی اور بچ نکلنے کی''۔ صاحبِ 'تدبر قرآن' نے اس کا ترجمہ ''پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی'' کیا ہے۔ ان دونوں تراجم میں الہام کا کوئی تصور نہیں دیا گیا۔ جو روایات اور تصوف کی وجہ سے ہمارے ہاں خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں الہام کے یہ معنے لئے جاتے ہیں کہ جو لوگ بہت عبادت گذار ہوتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے لگ جاتا ہے، اور یہ الہام ہوتا ہے۔ لیکن آیہ کریمہ میں اس بات کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ اس میں مومن و کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں ہے۔ ہر نفسِ انسانی میں اچھے یا برے کام کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ اب یہ اس نفس انسانی کے صوابدید پر ہے کہ وہ چاہے تو اچھے امور (تقویٰ) سرانجام دے اور چاہے تو برے کام (فجور) کرتا رہے، اس آیہ کریمہ سے مزعوم الہام کی کوئی سند نہیں ملتی۔

الہام کے سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ الہام اور وحی میں یہ فرق ہے کہ جس شخص کو الہام ہوتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مطلب اسے کہاں سے حاصل ہوا ہے جبکہ وحی کے وقت وہ جانتا ہے کہ یہ اسے کہاں سے، اور کس ذریعہ سے پہنچتی ہے۔ بعض مفسرین کرام کا یہ بھی خیال ہے کہ وحی و الہام یہ فرق ہوتا ہے کہ وحی سے حاصل کردہ علم یقینی ہوتا ہے جبکہ الہام سے حاصل کردہ علم ظنی ہوتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ جو علم خدا تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہو وہ ظنی ہو ہی نہیں سکتا۔ مفسرین کرام نے الہام کی جو تعریف (Definition) بیان فرمائی ہے۔ وہ تعریف ہی غلط ہے۔ پھر اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ مختلف حضرات کے الہام ایک ہی مسئلہ میں مختلف بیان ہوئے ہیں۔ اس کی ایک طویل فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے علم حاصل ہو، اور

اس میں باہمی تضاد ہو' یہ کبھی ممکن نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی تردید میں جو آخری کیل گاڑی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ الہام کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ مُلْهَم (جس کو الہام ہو) کو صرف کوئی مفہوم یا خیال الہام کیا جاتا ہے۔ مُلْهَم اس خیال کو خود اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ یہ نظریہ ہمارے علماء کرام میں چلا آ رہا تھا' لیکن اب سائیکالوجی اور فلولوجی (Phylology) کی ترقی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کوئی خیال بغیر لفظ کے آ ہی نہیں سکتا۔ زبان و خیال میں ظرف و مظروف کی نسبت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ طے شدہ بات ہے کہ خیالات زبان اور الفاظ کی قید سے کسی حال میں بھی آزاد نہیں ہو سکتے بغیر الفاظ کے مضمون و خیال کا الہام ہونا ہی ناممکن شے ہے۔ فلہٰذا آیہ کریمہ کا وہی مفہوم درست ہے کہ نفس انسانی میں نیکی (تقویٰ) اور بدی (فجور) کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ اب جس کا دل جو چاہے وہ تقویٰ کے کام کرے اور جس کا دل چاہے وہ بدی (فجور) اختیار کرے۔

علمِ لَدُنّی کی بحث

علم لدنی کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ یہ علم' رسول اللہ ﷺ سے سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ علم کا منبع و مصدر دماغ ہے۔ سینہ نہیں ہے۔ قرآن کریم نے بھی سوچ اور فکر کا مرکز دماغ کو قرار دیا ہے۔ قرآن کریم چونکہ عربوں کی روزمرہ کی زبان میں نازل ہوا تھا' اور محاورۂ عرب میں دل کو فکر کا مرکز قرار دیتے تھے اس لئے قرآن نے ان کی زبان کے لحاظ سے سینہ کو علم کا مرکز بیان کر دیا ہے۔ ورنہ جب قرآن نے خود علم کی تعریف کی ہے تو فواد یعنی دماغ کو ہی علم کا مرکز و ذریعہ قرار دیا ہے (17:36)- اگرچہ اردو کی مثال عربی پر حجت نہیں ہو سکتی لیکن اسلوب بیان اور انداز کلام تک زبانوں کا مشترک ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں علم ہوتا ہے کہ سوچ کا ذریعہ فواد (دماغ) ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہی کہتے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ آج سیر کو چلو۔ ہم یہ کبھی نہیں کہتے کہ دماغ چاہتا ہے کہ سیر کو چلیں۔ قرآن کریم کی رو سے سوچ کا ذریعہ دماغ ہے۔ دل نہیں ہے۔ لہٰذا علم لدنی کے بارے میں یہ نظریہ کہ یہ علم سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے۔ علمی طور پر غلط ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربی قواعد کی رو سے بھی یہ اصطلاح درست نہیں ہے۔ یہ اصطلاح خود عربوں کی وضع کردہ نہیں ہے۔ یہ صدر اول کے بہت بعد غیر عربوں نے وضع کی ہے۔ اس لئے یہ عربی قواعد کی رو سے بھی غلط ہے۔ عربی زبان میں لَــدُنَ کے معنے ہیں۔ ''طرف سے۔ ہاں سے'' مِن لَّـدُنْ حَـكِيْمٍ خَبِيْرٍ (11:1)- خدائے حکیم و علیم کی طرف سے۔ اس لئے لَـدُنِّـي کے معنے ہیں' میری طرف سے۔ علم لدنی کے لغوی معنے ہوئے' میرا دیا ہوا علم۔ لیکن اس سے مراد لیتے ہیں خدا کا دیا ہوا علم۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب بڑے ولی اللہ ہیں اور ان کو علم لدنی حاصل ہے تو عربی قواعد کی رو سے اس کے لغوی معنے یہ ہوئے کہ فلاں صاحب بہت بڑے ولی ہیں کہ ان کے پاس میری طرف سے دیا ہوا علم ہے۔ حالانکہ عربی قواعد کی رو سے یہ کہنا چاہئے تھا کہ فلاں ولی اللہ کو ''علم من اللہ'' یا ''علم من عنداللہ'' حاصل ہے۔ جس اصطلاح کا یہ حال ہو کہ وہ عربی قواعد کی رو سے ہی غلط ہو' تو اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔

جب اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل کرنے کے طریقہ کو جائز قرار دے دیا گیا تو پھر استخارہ بھی رائج ہو گیا۔ استخارہ کے معنے ہیں ''دو باتوں میں سے بہتر چیز کو طلب کرنا''۔ جب کوئی اہم کام کرنا ہوتا ہے تو استخارہ کر لیتے ہیں۔ اور اس کے

ذریعے منشائے خداوندی معلوم کرتے ہیں۔ جب کسی بیٹی کا رشتہ آتا ہے تو استخارہ کر کے معلوم کرتے ہیں کہ اس جگہ شادی کرنی چاہئے یا نہیں۔ ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ استخارہ کے ایجاب کے باوجود بیشتر اوقات وہ شادی کامیاب نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی لوگ اس عقیدے پر قائم ہیں۔ استخارہ کا رواج صرف عوام میں ہی نہیں ہے بلکہ حضرت اقدس جناب مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق تحریر ہے کہ جب آنجناب نے مسلم لیگ میں شرکت کی تھی تو حضرت اقدس نے جناب باری میں استخارہ کیا تھا' اور استخارہ کے ایجاب میں آنے کے بعد حضرت نے مسلم لیگ Join کی تھی' لیکن واضح رہے کہ استخارہ کے ذریعے براہ راست علم خداوندی حاصل کرنا' ختم نبوت کی تردید کرنا ہے۔

اسی طرح لوگ قرآن کریم سے تفاول بھی کرتے ہیں' مغل بادشاہ دیوانِ حافظ سے تفاول کرتے تھے۔ یہ تفاول عام معمولی باتوں میں نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ جب کسی اہم مہم پر جاتے تھے تو دیوانِ حافظ سے تفاول کر لیتے تھے۔

خوب ذہن نشین فرمالیں کہ اللہ تعالیٰ سے کسی شخص کو بھی کسی طرح سے بھی اب علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ ختم نبوت کے معنے ہی یہ ہیں کہ حضورﷺ کے بعد کسی شخص کو کوئی علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے' کسی ذریعے سے بھی' حاصل نہیں ہوسکتا' جو علمِ خداوندی حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے وہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور توہین رسالت اور توہین قرآن کا مرتکب ہوتا ہے۔

اس نظریہ کی تائید میں کہ حضورﷺ کے بعد کسی شخص کو بھی' کسی ذریعے سے علم خداوندی حاصل نہیں ہوسکتا۔ سورہ شوریٰ کی آیت حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس آیہ کریمہ کی وضاحت اس سے پیشتر کئی مرتبہ کی گئی ہے۔ اس کو ایک بار پھر نہایت وضاحت کے ساتھ' حد درجہ آسان کر کے' اس درخواست کے ساتھ پیش خدمتِ عالی کیا جاتا ہے کہ جو حضرات اس نظریہ کے قائل ہیں وہ اس آیہ کریمہ کے مفہوم کو ضرور بالضرور ذہن نشین فرمالیں تاکہ وہ اس بارے میں کسی شک وشبہ میں نہ رہیں۔ یہ قرآن کریم کی اہم ترین آیات میں شمار ہوتی ہے اور یہی وہ آیہ کریمہ ہے جس کا غلط مفہوم لینے سے تصوف' تشیع' احمدیت کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر اس کا قرآنی مفہوم اختیار کر لیا جائے تو یہ تینوں نظریات خود بخود منقرض ہو جاتے ہیں۔

ارشاد جناب باری تعالیٰ ہوتا ہے: **وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ** (42:51)- کسی آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر (1) وحی کے ذریعے (2) یا پردہ کے پیچھے سے (3) یا کوئی فرشتہ بھیج دے' پھر وہ جو چاہتا ہے پیغام بھیجتا ہے' بے شک وہ عالی شان حکمت والا ہے۔

اب آپ اس آیہ کریمہ کا وہ مفہوم ملاحظہ فرمائیں جو ہمارے مفسرین کرام نے لکھا ہے۔ اس بات پر حیرانی ہوتی ہے کہ ایک ہزار سال کے عرصہ میں ہمارے علماء کرام نے غلط مفہوم لیا ہے اور سب فرقوں نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ اس سارے عرصہ میں کسی بھی فرقہ کے' کسی ایک مفسر نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا' لیکن ان کے مفہوم میں جو غلطیاں ہیں وہ اس درجہ واضح ہیں کہ ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور ان کی نشاندہی بھی جناب کی خدمتِ عالی میں پیش کی جاتی ہے۔ تحریک طلوع اسلام وہ پہلی تحریک اور خالص قرآنی فکر ہے جس نے اس ایک ہزار سال سے سرزد ہوتی ہوئی متفق علیہ غلطیوں کی نشاندہی

کی ہے۔

ہمارے مفسرین کرام نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے اپنے کلام کا طریقہ بتایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ (1) پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے دل پر اپنا کلام الہام فرما دیتا ہے اور پیغمبر اس کو محفوظ کر لیتا ہے۔ (2) دوسرا طریقہ من ورائے حجاب ہے۔ یعنی پردے کی اوٹ سے اور یہ موسیٰؑ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس میں عموماً مفسرین کا اتفاق ہے اور ہمیں بھی اس دوسرے طریقہ سے اتفاق ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ مخصوص تھا۔ (3) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا رسول یعنی کوئی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ اللہ کے حکم سے جو کچھ اللہ چاہتا ہے، پیغمبر کے دل پر الہام کر دیتا ہے۔ اس آیت کا یہ مفہوم ''تدبر قرآن'' سے لیا گیا ہے۔

تفسیر نمونہ ایران میں انقلابِ ایران کے بعد تحریر کی گئی ہے، اسے (غالباً) وہاں کی اسلامی حکومت کی تائید بھی حاصل تھی، اسے آٹھ علماء کرام نے تحریر فرمایا ہے جن سب حضرات کے نام کے شروع میں حجت الاسلام والمسلمین تحریر کیا گیا ہے۔ ان سب ''حجج'' نے بارہ سابقہ تحریر شدہ تفاسیر سے استفادہ کیا ہے جن کے نام اس تفسیر کے شروع میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس تفسیر نے جو مفہوم اس آیت کا کیا ہے۔ سابقہ تمام بارہ تفاسیر نے بھی یہی مفہوم کیا ہوگا۔ ان تمام علماء کرام نے اس آیت کی تفسیر کا عنوان یہ تحریر کیا ہے ''انبیاء کے خدا کے ساتھ رابطے کے ذرائع'' اس کے بعد تقریباً وہ ہی تین طریقے بتائے ہیں جو ہمارے جمہور علماء بتاتے ہیں جو اوپر ''تدبر قرآن'' کے حوالہ سے تحریر کر دیئے گئے ہیں۔ اس تفسیر کے سلسلہ میں ہمارا مقصد صرف اس کے عنوان کا حوالہ دینے سے ہی پورا ہو جاتا ہے کہ وہ ان ذرائع کو صرف نبیوں تک محدود سمجھتے ہیں (اس پر تبصرہ آگے آتا ہے)۔ ان دو حوالوں کے علاوہ دیگر تفاسیر کے حوالے سے مضمون طویل ہوتا ہے، اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

پھر تجدید یادداشت کے لئے مختصراً پیش خدمتِ عالی کیا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام کے مطابق اس آیت میں صرف انبیاء کرام کو وحی ملنے کی تین صورتیں بیان کی جا رہی ہیں۔ پہلی صورت براہ راست وحی (الہام) دوسری قسم پردے کے پیچھے سے کلام جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ مخصوص ہے اور تیسری قسم اللہ کے پیغام رساں ملک (فرشتہ) کے ذریعے جو رسول پر الہام کرتا ہے۔ لیکن علمائے کرام کی یہ تفسیر ان وجوہات سے غلط ہے:

(1) ہمارے مفسرین کرام کی پہلی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اس آیت کو صرف انبیاء تک محدود کر دیا ہے اور باقی سب انسانیت کو Ignore کر دیا ہے۔ آیہ کریمہ نے ''بشر'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور ساری انسانیت کو علم خداوندی حاصل ہونے کے طریقے بتائے ہیں، جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے۔ تفسیر نمونہ نے عنوان ہی ''انبیاء کے خدا کے ساتھ رابطے کے ذرائع قرار دیا ہے۔ اس آیت کا منشاء وفحویٰ اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک ان ذرائع کو پوری انسانیت پر محیط نہ کیا جائے اور جب تک یہ طریقے ساری انسانیت کو Cover نہ کر لیں۔ اگر آیہ کریمہ میں **وما کان لنبیٍ** ہوتا کہ کسی نبی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر ان طریقوں سے تو علماء کرام کی تفسیر درست ہو جاتی کہ اس آیت میں انبیاء سے کلام کرنے کے طریقے بتائے جا رہے ہیں لیکن یہ آیت پوری انسانیت کو علم دینے کے ذرائع کا احاطہ کر رہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو پوری انسانیت کو علم دیا ہے اور پوری انسانیت کو **یاایھا الذین آمنوا**

اوریاایھا الناس کہہ کرخطاب کیا ہے۔

(2) دوسری غلطی مفسرین کرام کی یہ ہے کہ آیہ کریمہ میں رسول کے معنے رسول ہی درست ہیں۔محض ایک خلاف قرآن نظریہ کوزبردستی آیت میں داخل کرنے کے لئے یہاں رسول کے معنے فرشتہ کئے گئے ہیں۔ جب کوئی لفظ اپنے اصلی معنی میں استعمال ہوسکتا ہے تو وہ اصل معنے لینا ہی ضروری ہے۔ یہاں رسول کے معنے فرشتہ کرنے کے لئے کوئی قرینہ موجودنہیں ہے۔ اصلی معنے چھوڑ کر مجازی معنے لینا مناسب نہیں۔

(3) کلام الٰہی کی یہ تیسری قسم یعنی بذریعہ فرشتہ پیغام ارسال کرنا خودپہلی قسم وحیاً میں داخل ہے۔

(4) وحی کی پہلی صورت کا مفہوم الہام کیا گیا حالانکہ یہاں الہام کا دوردورکوئی تعلق نہیں ہے۔الہام کی بحث طویل ہے۔اس جگہ اس کو دہرانا مشکل ہے۔لیکن یہ بات اتنی واضح ہے کہ جس نبی کو وحی مل رہی ہو اسے الہام سے کیا فائدہ۔اگر الہام کوئی چیز ہے بھی تب بھی الہام کے قائلین کے نزدیک وحی اور الہام میں سورج اور چراغ کی نسبت ہے۔ جب وحی مل رہی ہے تو الہام کا سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔

(5) انسان کے خدا سے تعلق ہونے کے یہ تین طریقے ہیں جس کی رو سے صلصلۃ الجرس گھنٹیوں کی آوازیں خواب مبشرات اور باقی کئی طریقے جو ہمارے مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں سب خارج ازامکان ہوجاتے ہیں۔

اب آیہ کریمہ کا درست مفہوم خدمتِ عالی میں پیش کیا جاتا ہے۔غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

اس آیہ کریمہ میں صرف انبیاء کرام کونہیں بلکہ پوری نوعِ بشر تک اللہ کی ہدایت وصول ہونے کے طریقوں کو بیان کیا جارہا ہے۔انسانوں کی دوقسمیں ہیں ایک تو رسول اور دوسرے رسولوں کے علاوہ تمام نوعِ بشر۔ زیرنظر آیہ کریمہ میں پہلے دو طریقے رسولوں کو ہدایت ملنے کے بتائے جارہے ہیں۔ایک وہ وحی ہے جو جبرئیل لاتے تھے۔جیسا کہ حضورﷺ پر وحی آتی تھی یعنی جبرئیل کے ذریعے جس کی بابت ارشاد ہے: فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ (2:97)۔اوردوسرا طریقہ من ورائے حجاب فرشتے کے بغیر براہ راست۔اس طریقہ سے کہ آواز تو سنائی دے لیکن متکلم دکھائی نہ دے۔جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی طرف وحی ہوئی تھی جس کا ذکر سورہ طٰہٰ میں ہوا یہ طریقہ صرف حضرت موسیٰؑ سے مخصوص تھا۔ یہ مذکورہ بالا دوطریقے انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھے۔

اب رہے وہ تمام لوگ جن پر تمام نوعِ بشر مشتمل ہے اور جو رسول کے زمرہ میں نہیں آتی ان کے ساتھ کلام خداوندی کرنے کا طریقہ یہ تھا اور ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف اپنا رسول بھیجتا تھا اور اس رسول کی معرفت اپنا کلام تمام انسانوں کو پہنچاتا تھا۔ یہ رسول ان کے درمیان واسطہ و ذریعہ بنتا تھا۔ اللہ تعالیٰ رسول کے علاوہ کسی بھی بشر سے بات نہیں کرتا تھا اور وحی الٰہی یعنی علم خداوندی بھی انسانوں میں صرف انبیاء کرام کی طرف آتی تھی۔ رسولوں کے علاوہ تمام انسانوں کو خدا کی وحی صرف انبیاء کرام کی معرفت ہی ملتی تھی۔

آیہ کریمہ کا جو درست مفہوم پیش خدمت عالی کیا گیا ہے اس سے اگلی آیت نے اس مفہوم کو مزید واضح کردیا ہے جبکہ حضورﷺ کے متعلق ارشاد ہوا کہ: وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحاً مِّنْ أَمْرِنَا (42:52)۔ہم نے اسی طرح جس طرح کہ ہم رسولوں کے ساتھ بذریعہ وحی کلام کرتے تھے تیری طرف بھی

عالم امر سے وحی کی ہے۔ آیت کے اس حصہ تک تو خدا کے اس کلام کا ذکر ہوا جو اس نے حضور کے ساتھ بذریعہ وحی کیا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا: وَإِنَّكَ لَتَهْدِيْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (42:52)۔ اور اے رسول تو یقیناً لوگوں کی راہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے اور اس طرح عام عالم بشریت کو کلام الٰہی پہنچاتا ہے۔

اس مضمون میں حد درجہ کوشش کی گئی ہے کہ آیت کا مفہوم خوب روشن اور واضح کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ آیت بڑی اہم اور بنیادی ہے۔ محترم المقام جناب پرویز صاحب نے اس آیت کی تفسیر مختلف مقامات پر تحریر کی ہے۔ ان میں سے چند مقامات نقل کئے جاتے ہیں تاکہ اس آیت کا مفہوم جناب کے خوب ذہن نشین ہو جائے۔ آیت آپ اپنے ذہن مبارک میں سامنے رکھیں۔ جناب پرویزؒ نے تحریر فرمایا: ''اس آیت میں کہا گیا ہے کہ انسانوں میں خدا کی ہم کلامی کے تین طریقے ہیں۔ پہلے دو طریقے انبیاء کرام کے ساتھ ہمکلامی کے ہیں اور وہ ہیں بذریعہ وحی یا پس پردہ گفتگو۔ اور تیسرا طریقہ عام انسانوں (انبیاء کے علاوہ دوسرے انسانوں) سے ہم کلامی کا۔ یہ طریقہ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی طرف وحی کرتا ہے اور وہ نبی اس وحی کو لوگوں تک پہنچا دیتا ہے جس طرح آج ہم سے خدا قرآن کے ذریعے ہم کلام ہوتا ہے۔'' (برقِ طور' صفحہ 183)۔

مطالب الفرقان جلد سوئم' صفحہ 22 پر تحریر ہے۔ خدا انسان سے کلام کرتا ہے کس طرح؟ اِلَّا وحیاً' وحی کے ذریعے اور من ورائے حجاب یا پردے کے پیچھے سے' (جس طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا) یہ دونوں طریقے حضرات انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھے باقی رہے دوسرے لوگ (یعنی غیر از نبی) سو ان کے ساتھ خدا کے کلام کرنے کا طریقہ یہ ہے: أَوْ يُرْسِلَ رَسُولاً فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (42:51)۔ ان کی طرف خدا کا رسول بھیجا جاتا تھا جو ان تک خدا کے وہ احکام پہنچاتا تھا جنہیں خدا اپنے قانون مشیت کی رو سے' اس رسول کو دیتا تھا۔ یعنی غیر از نبی انسانوں سے خدا براہ راست کلام نہیں کرتا۔ اس کا کلام' انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتا ہے۔ واضح رہے کہ وحی کے معنے' کسی کے حکم کو کسی کی طرف پہنچانے کے بھی ہیں''۔

لغات القرآن' صفحہ 1494 پر مرقوم ہے:

''اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ بشر (انسانوں) کے ساتھ خدا کس طرح کلام کرتا ہے۔ بشر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک انبیاء اور دوسرے غیر انبیاء۔ پہلے انبیاء کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کا کلام یا تو وحی (فرشتے) کے ذریعے پہنچتا ہے (جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا) اور یا براہ راست پردے کے پیچھے سے بات سنائی دیتی ہے (جیسے حضرت موسیٰؑ کی صورت میں ہوا) باقی رہے غیر انبیاء تو ان تک صرف رسولوں کے ذریعے سے خدا کا کلام پہنچتا ہے۔ یہ کلام اب قرآن کریم کے اندر ہے' اس کے باہر اور کہیں نہیں۔ اس اعتبار سے یہی قرآن کریم ہم پر بھی نازل ہوا ہے (ینزل علیکم) (3:71, 2:105)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہماری طرف نازل ہوا ہے۔''

مفہوم القرآن میں اس آیت کا مفہوم یہ تحریر ہے:

''(خدا ہر انسان سے براہ راست ہم کلام نہیں ہوتا) اس کی ہم کلامی کے تین طریقے ہیں۔ دو طریقے انبیاء

سے مخصوص ہیں اور تیسرا طریق عام انسانوں کے لئے۔انبیاء سے خدا کی ہم کلامی کا طریق یہ ہے کہ کبھی خدا کی بات نبی کے دل میں ڈال دی جاتی ہے (2:97)' اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پس پردہ خدا کی باتیں کان تک پہنچ جاتی ہیں جیسے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ (4:164, 2:253) یہ دونوں طریقے انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔ باقی رہے غیر انبیاء (عام انسان) سو ان کی طرف رسول بھیجا جاتا ہے جو ان تک وحی پہنچاتا ہے جسے خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اس رسول کو دیتا ہے (کوئی غیر از نبی خدا سے براہ راست ہم کلام نہیں ہوسکتا۔) یہ انتظام اس خدا کی طرف سے ہے جو علم کی انتہائی بلندیوں کا مالک ہے اور جس کا ہر فیصلہ اور انتظام حکمت پر مبنی ہے۔''

آپ نے اس آیت کی وضاحت کے سلسلہ میں 4 اقتباسات جناب محترم پرویز صاحب کے ملاحظہ فرمائے۔امید ہے کہ اب اس آیہ کریمہ کا مفہوم جناب کے ذہن نشین ہو گیا ہو گا۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر شگفتہ طاہر، کراچی

میری زندگی کا سفر

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اُسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اللہ تعالیٰ نے صنفِ نازک یعنی عورت کو جذبات، احساسات اور رحمت کے بے حساب تحائف سے نوازا ہے۔ وہ اپنی فطرت کی ولولہ انگیز شوخیوں کے ساتھ جب دنیا کے سکوت میں نغمۂ زندگی کے ساز چھیڑتی ہے تو مختلف انواع و اقسام کی رنگینیاں اُس کا ساتھ دینے کو بے قرار ہوتی ہیں۔ اُسے کسی رنگ و نسل، ذات یا علاقائی تفریق سے بالاتر ہو کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں بھی ہو اپنی بساط سے آگے نکل جانے کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ جب خالقِ کائنات نے اپنی اِس مخلوق کو تخلیق کیا تو اُس کی ترتیبِ خلیات میں اُن تمام خوبیوں کو یکجا کر دیا جس کے طفیل اِس دنیا کا کاروبار مؤثر طریقے سے چل سکے۔ اِس بات کا تجزیہ ربِ کائنات سے بہتر کون کر سکتا ہے کہ اُس کا مقام و مرتبہ کیا ہونا چاہیے؟ یا اِس دنیا کے کارخانے میں عورت کو کس درجہ پہ فائز کیا جانا چاہیے؟ مرد کے لئے رفیقِ سفر، گوشۂ سکون، اور راحتِ جاں ہے تو دوسری جانب وہ رحمت کی تصویر دکھائی دیتی ہے جس کی آغوش میں پرورش پانے والے ننھے ننھے پودے تناور درخت بن جاتے ہیں، جن کی خاطر وہ پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ کیا اِس ہستی کو دنیا میں اِس کا صحیح مقام مل سکا ہے؟

قارئینِ کرام! یہ وہ موضوع ہے جس پر ربِ کائنات نے خود قلم اُٹھایا ہے۔ اپنی اِس تخلیق کی حفاظت کے لئے قوانین اور اصول مرتب کئے، خود شہادت کے لئے انسانوں سے ہم کلام ہوا جو کہ قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر محفوظ ہے۔ بقول علامہ اقبال اگر میں قرآن نہ جانتا اور مسلمان نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ قرآن کو کسی عورت نے لکھا ہے، جس نے عورت کے لئے وہ مقام تجویز کیا ہے جو کسی بھی مذہب نے نہیں دیا!!!

ذرا غور فرمایئے تو ہمیں زیادہ دور جانے کی قطعاً ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہمارے آس پاس، معاشرے میں اِس کی بے بسی کی تصویر نظر آئے گی، وہ جس کے وجود کو شاعرِ مشرق اقبال کائنات میں رنگ سے تشبیہ دیتا ہے، اُس کے رنگوں کو کس

طرح مردوں کے معاشرے میں پذیرائی حاصل ہوئی ہے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ رسم ورواج کے پہرے ہوں یا مذہب کی آڑ لی جائے' سب کے سب عورت کو سیدھا رکھنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو یا مذاہب کے حوالے سے، اگر ایک طائرانہ نظر ڈالئے عورت اپنے جائز حقِ انسانیت کے لئے کوشاں نظر آئے گی' ایسا آخر کیوں؟

حقِ انسانیت جو کہ بلا امتیاز اُسے حاصل ہونا چاہیے تھا وہ تو حاصل نہیں ہو سکا۔ جب کہ اُس کو واضح کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً خدا تعالیٰ اپنے نبیوںؑ کو بھیجتے رہے۔ پھر اپنے آخری رسول ﷺ کے ذریعے اس حجت کو تمام کر دیا۔ تمام مذاہب نے اِس معاملے میں بھی اصل تعلیمات کو بدل ڈالا۔ عجم کے سازشی ٹولے نے بھی کچھ کم کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اُنہوں نے قرآن کی تشریح میں وہ تمام غلط عقائد شامل کرنے کے بعد ایسے فتوے جاری کر دیے کہ مجال ہے' اُن کے متعلق کوئی بات کہے گرچہ کہ وہ بہتان ہوں ذاتِ خداوندی پر۔ جن آسمانی کتابوں کے منحرف ہونے کی دلیل خود قرآنِ کریم پیش کرتا ہے' ان کو تفسیروں میں بیان کر کے یہ شہادت حاصل کی گئی کہ معاذ اللہ قرآن نامکمل ہے۔ اگر اِس کو سمجھنا ہے تو ضرور سیاق وسباق کے حوالے سے' انسانوں کی وضع کردہ من گھڑت روایات سے ہی سمجھا جانا چاہیے' ورنہ اول تو سمجھ ہی نہیں آ سکتا اور بالفرض محال سمجھ آ ہی گیا تو شیطان آپکو غلط راہ پہ لگا دے گا اور آپ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے لہٰذا خاص طور پر قرآن سمجھنے کے لئے اپنی عقل کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بھی بزرگانِ دین' فقہی علماء بیان کرتے ہیں وہ اُن کی عمروں کی محنت اور عرق ریزی ہے لہٰذا جس پر وہ کاربند رہے تم بھی اُسی پر کاربند رہو۔ چونکہ ایسی روایات توریت' انجیل کے نسخوں سے حاصل کی گئی تھیں' ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مختلف حدیث کی کتابوں اور بزرگانِ دین کی کتابوں سے وارد کی گئیں اور اُن کے ناموں سے منسوب ہیں۔ جن کی تحقیق کرنے کی بھی اجازت نہیں' لہٰذا ہر فرقہ اپنے اپنے بزرگانِ دین کے اسلام پر قائم ہے اور دوسرے فرقے والوں کو کافر سمجھتا ہے۔ اب بتائیے اگر اسلام کی یہ تعلیمات ہوتیں تو ان فرقوں کو نبی ﷺ خود بناتے اور اللہ تعالیٰ اُن کی تائید فرماتے۔ بہرحال یہ تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ مرّ وجہ اسلام نے اسلام اور مسلمان کا تشخص مٹا دیا ہے اور اس حقیقت سے بھی اِنکار ناممکن ہے کہ ہمیں سوچنا چاہیے کیا یہ ہی مسلمان مطلوبِ قرآن ہیں اور جنت کا وعدہ بھی اِنھی سے ہے؟؟

کلامِ رّبانی ایک آئینہ کی مانند صاف وشفاف ہے اور ہر شخص کو آج بھی اُس کا چہرہ واضح طور پر دکھا دیتا ہے بشرطیکہ کوئی دیکھنا چاہے۔ اُمتِ مسلمہ اِس فریضہ کو سرانجام دینے کے لئے کتنی کامیاب ہے وہ تو صاف ظاہر ہے۔ اُس نے اقوامِ عالم کو اپنے معاشرتی' معاشی' عائلی نظام کا جو نقشہ دِکھایا ہے، معذرت کے ساتھ عورت اپنے عورت ہونے پر شرمسار رہے۔ مذاہبِ باطلہ کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اس عورت نے اپنے لئے جب بھی کوئی مسیحا تلاش کیا اُسے کوئی سہارا تو مل ہی گیا لیکن ہمدم یا

رفیقِ سفر نہ مل سکا۔ آج تو شاید اِن لفظوں کے معنیٰ و مفہوم ہی بدل چکے ہیں۔ نہ ہم جانتے ہیں کہ عزتِ نفس کیا ہوتی ہے اور نہ ہی ہم دوسرے انسان کی تکریم و آبرو کو قابلِ ستائش سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو بہتر ہے، وہی معیارِ عظمت دوسروں کو نظر آنا چاہیے۔ خدا تعالیٰ کے بنائے تمام اصول، صرف دوسروں کو وعظ کرنے کے لئے مناسب نظر آتے ہیں، اُن کو خود اپنے لئے قابلِ عمل بنانے کے لئے مزید رَدوبدل کی ضرورت ہوتی ہے۔

ذرا غور فرمائیے! کہ یہ دوہرا معیار کس طرح ہمارے بنیادی عقیدے پر ضربِ کاری ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اسکیمِ تخلیق پر ہم اگر توجہ کرتے ہیں، تو سمجھ یوں آتا ہے کہ ہر شے کو اُنہوں نے جوڑے کی صورت میں پیدا فرمایا ہے، مثلاً نباتات، حیوانات، جمادات، حتیٰ کہ غیر مرئی اشیاء جیسے دن اور رات، زمین و آسمان، گرم و سرد، دھوپ چھاؤں، روشنی اندھیرا یہاں تک کہ دنیا کا جوڑا آخرت ہے تو مرد و عورت کے جوڑے میں کیا نئی بات ہے؟ قرآن اِن سب کو ایک دوسرے کے زوج کہتا ہے۔ ہمارے یہاں صرف زوجہ ہوتی ہے زوج کا تو تصور نہیں ہے!!!

دنیا میں کسی حیوان نے بھی اپنے جیون ساتھی کے ساتھ اتنا امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جتنا کہ انسان نے رکھا ہے۔ کبھی آپ اگر شیر اور شیرنی کی زندگی گزارنے کے طریقوں پر غور کریں، اُن میں کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا دونوں ایک ہی قسم کی غذا شکار کر کے کھاتے ہیں، ایک ہی طرح کے ماحول میں رہتے ہیں، صرف افزائشِ نسل کی ذمہ داریاں مختلف ہیں جو اُن کی جبلّت میں ودیعت ہوئی ہیں۔ کبھی شیر، شیرنی کو ڈانٹتا، آنکھیں نکالتا یا اپنی برتری کے زعم میں اِٹھلاتا نظر نہیں آئے گا۔ دونوں اپنے اپنے دائرۂ کار میں زندگی گزارتے نظر آئیں گے۔

انسان ایک سوشل حیوان ہے جس کو کہ ایک غیر نشوونما یافتہ ذات عطا کی گئی ہے۔ جو اسے باقی تمام مخلوق سے الگ کرتی ہے اُس ذات یا شخصیت کو تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِسی تربیت کی ذمے داری انسانی معاشرے اور والدین پر عائد ہوتی ہے۔ یہ تربیتی پروگرام ماں کی گود سے شروع ہو کر گور (قبر) کے کناروں تک چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ذمے داری سے خود کو بھی بریٔ الذمہ نہیں قرار دیا بلکہ وہ انسانوں کی راہنمائی اپنے انبیاء علیہم اسلام کو بھیج کر فرماتا رہا ہے۔ انسانیت کو جب بھی اُس نے معصیت میں ڈوبتے ہوئے پایا اپنی رحمتوں کے در کھول دیئے۔ انسانی ذات کے تربیتی پروگرام کو کامیابی سے مکمل کرنے کے بعد جو انسان وجود میں آتا ہے اُس کو قرآن مومن و مومنات کہتا ہے بلا تخصیص مرد و زن کے۔ وہ دونوں ہی کے لئے ابدی خوشیوں کی بشارت دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک مرد کی زندگی میں کم از کم چار قریبی رشتوں سے خواتین اثر انداز ہوتی ہیں، یعنی کامیاب مرد کے پیچھے کسی سمجھدار و باصلاحیت عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم کہیں گے کہ کامیاب عورت کے پیچھے بھی کسی دُور اندیش مرد کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر ماں ہے تو اُس کی گود ہی بچے کے لئے پہلی تربیت گاہ ہے۔ جہاں سے وہ

دنیا میں بہترین زندگی گزارنے کا گُر سیکھتا ہے' اِسی آشیانے سے فضاؤں میں بلندی کے لئے پرتولتا ہے۔ وہ جب دنیا کے ریلے میں شامل ہوتا ہے تو اپنی پہچان ایک ایسے ہواباز کی طرح کرواتا ہے جو آپ کو ہزاروں میل فضا میں بلند کرنے سے پہلے اعتماد میں لیتا ہے اور اپنی پرواز کے تحفظ کی ضمانت دیتے ہوئے اپنے ساتھ خوشگوار سفر کی امید ظاہر کرتا ہے۔ اِسی مردِ مومن کو قرآن عالم کا خطاب دیتا ہے۔

قوموں کی تقدیر انہی ماؤں کی گود سے بنتی ہے۔ اُسی ماں کی تربیت کے لئے خدائے بزرگ و برتر نے اصول مرتب کئے اور تحفظ کی ضمانت کے لئے مرد کو ذمہ دار بنایا۔ اُسی ماں کی تربیت بحیثیت بیٹی' بہن یا بیوی کرنے کے بعد ہی' تو نرگس گلشن میں خوشیوں کے شادیانے بجائے گی' وہ اپنی بےنوری کا ماتم کرتی نظر نہیں آئے گی کہ جانے کب' کہاں' کس صدی میں کوئی دیدہ ور پیدا ہو' جو اِس دنیا میں انقلاب لائے۔ اِس امر کی غرض و غایت جاننے کے بعد ہم اُن شواہد کا تجزیہ کرنا چاہیں گے کہ کیا وجوہات تھیں جو مرد نے اِس صنفِ نازک کے ساتھ وہ رشتہ استوار نہیں کیا جس کے واسطے دونوں کو بنایا گیا تھا؟؟؟ انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کرنے سے پہلے اُس کو عقل' فہم و ادراک اور باصلاحیت بنایا تاکہ اُس پر ذمہ داری جب ڈالی جائے تو وہ گریز کی راہیں نہ تلاش کرے۔

ہم جس صنفِ نازک کی بات کر رہے ہیں اُسے اِس جہانِ قوس قزح نے اپنے دامن میں کہاں جگہ دی ہے' یہ جان کر یقیناً آپ کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوگی۔ دنیا کی اربوں سال کی تاریخ اِس بات کی گواہ ہے کہ اگر کسی ذی روح کے حقوق کا استحصال ہوا' تو وہ عورت ہی تھی۔ سب سے پہلے اگر کسی انسان نے انسان کو اپنا غلام بنایا تو وہ مرد تھا جس نے اپنے رفیقِ سفر کو غلامی کی زنجیریں پہنائیں' اُس نے نرم' رحم دل اور معصوم سی آرزوئیں رکھنے والی عورت کو کم عقل' کند ذہن اور کمزور اعصاب کی مالک قرار دیا اور دوسری جانب تمام گناہوں کی ذمہ دار ٹھہرا کر خود انتہائی بابرکت' مطلوب کائنات' وجہءِ تخلیقِ کون و مکاں کہلایا۔ یوں خدا تعالیٰ کی اِس بہترین تخلیق کو رسوا کر دیا کہ وہ خود بخود ہر الزام کو اپنے نصیب کا حصہ سمجھنے لگی۔ اُس کی سوچ اتنی محدود ہو کر رہ گئی کہ وہ اپنے بنیادی حقِ انسانیت کو بھی بھول گئی۔ اُس کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جاتا تھا اُس کے لئے کہیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں' آج کی بیسویں صدی کے سائنسی دور میں بھی وہ جن جن مظالم کا شکار ہے اُس کا عشرِ عشیر بھی منظرِ عام پر آنے نہیں دیا جاتا۔

عیسائیت نے تو عورت کو ازلی گناہ کی ذمہ دار ٹھہرایا' جس کے تحت وہ جنت سے نکالی گئی اور اُس کی وجہ سے حضرت آدم صاحب نکالے گئے پھر اُن کی مقدس کتابوں میں اِس دوسرے درجہ کی مخلوق کا ذکر اِس طرح ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو مرد کے لئے سامانِ دل لگی کے طور پر بنایا گیا ہے۔ وہ بھی بائیں پسلی کے اُس حصے سے جو سب سے زیادہ ٹیڑھا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ تو طے پا گیا کہ اِس کو سیدھا کرنا بہت مشکل ہی نہیں

بلکہ ناممکن بھی ہے۔ کیوں کہ وہ سیدھی ہو ہی نہیں سکتی' ٹوٹ سکتی ہے۔ (چونکہ پسلی ٹیڑھی ہے اُسے سیدھا نہیں کیا جاسکتا) البتہ ہاں یہ تو ہوسکتا ہے کہ اِسکو کبھی کبھی یونہی برداشت کرلیا جائے لیکن اُس کے نقطۂ نظر سے زیادہ متفق ہونے سے اپنی سُبکی ہونے کا خطرہ تو موجود رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی دل لگی' دل کی لگی میں بدل جاتی ہے تو بھی وجہء دیوانگی کو وہ اپنی آشفتہ سری کہنے کی بجائے' اُسی جنموں جلی کے کھاتے میں ڈال کر گریباں چاک کئے پھرتا ہے!

کہیے ہے نا دلچسپ اور دلگداز یہ داستاں!!!

ہماری دنیا کے شرفاء کا تو حال مت پوچھئے۔ اُن پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ جو چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا۔

بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا تو عربوں کے وحشی معاشرے کی رسم تھی' لیکن مغرب کے ترقی یافتہ معاشرے کا حال کیا کچھ کم ہے جہاں عورت اپنے تحفظ کے لئے کوئی آشیاں مثلِ سائباں نہیں پاتی' یہاں تک کہ بیٹی اپنے باپ' بھائی سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ہمارے ترقی پذیر معاشرے کا معاملہ بھی عجب ہے جو بیٹی کی پیدائش سے جوانی تک کے سفر کے لئے اُس کو ذمہ داری اور بوجھ سمجھتے ہیں اور ہر ممکن اُس کو اپنی گردن سے اُتار پھینکنے کو تیار نظر آتے ہیں۔ بیٹی اور بیٹے کی پرورش' تعلیم و تربیت' غذا میں تخصیص اور تفریق کی صورتحال سے تو سبھی واقف ہیں' یقیناً کچھ لوگ اعتراض کرتے نظر آئیں گے کہ نہیں جی! ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا' ہم تو بیٹی کو اللہ کی رحمت تصور کرتے ہیں۔ اُنہی کا معاملہ بیٹی کی شادی' مہر' جائداد کی تقسیم اور اگر وہ بیٹی کہیں شادی کی خواہشمند ہو یا اُسے شادی سے انکار ہو' بالخصوص تو پھر وہاں کس طرح اس بیٹی کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

ہندوؤں کے ہم پر بہت ''احسان'' ہیں اُن کا کلچر ہمارے معاشرے کا ثقافتی اثاثہ ہے۔ جس پر مذہب کا مخملیں غلاف چڑھا کر ہم اکثر ایک دوسرے سے اگلے پچھلے جنموں کا بدلہ لیتے ہیں۔ ہم بہت حساس دل کے لوگ ہیں ذرا سی اُونچ' نیچ کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر بعض اوقات بُری مثال معاشرے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن لمحوں کے اُس بھنور سے کوئی ایسی کوڑی ڈھونڈ کر نہیں لاتے جس سے راہِ عمل تلاش کرسکیں۔ گھر کے نگر میں عجب طرح کی انوکھی کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔ جن کی بنیاد ذاتی رنجشیں' عداوتیں' انتقام' حسد جیسے جذبات کی بے راہ روی ہوا کرتی ہے۔ تعلیم و تربیت جس کے مقاصد تعمیرِ انسانیت و ترقی معاشرہ ہوں۔ وہاں اس قسم کی خرافات کی گنجائش ہی کہاں ہوتی ہے!!!

اسلام جہاں ربطِ خدا و بندہ کو مضبوط بناتا ہے وہاں ایک مضبوط گھریلو نظامِ زندگی بھی دیتا ہے۔ جس میں مرد و عورت اپنی اپنی زندگی خوش اسلوبی و وقار سے بسر کرتے ہیں' دونوں پر قرآن نے جو ذمہ داری عائد کی ہے اُس کے مطابق ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں' ایسے گھر میں جہاں سوچ و افکار کی آزادی ہو' علم کی بارگاہ سے اپنی راہیں اُستوار کی جاتی

ہوں وہیں پر اولاد صحیح تربیت پا سکتی ہے۔قرآن' عیسائیت کے اِس دعوے کو یکسر رد کرتا ہے کہ عورت کی تخلیق مرد کے بعد یا اُس کی پسلی سے ہوئی۔فرمایا گیا کہ: **اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ** (اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جرثومۂ حیات سے پیدا کیا۔) **وَ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا** (اور اُس جرثومۂ حیات سے اُس کا جوڑا بنایا) یعنی وہ جرثومۂ حیات دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور پھر **وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً (4:1) اُن دونوں کے اِمتزاج سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔**

دونوں کو نفسِ واحدہ یعنی ایک ہی حیات کے سیل یا جرثومے سے بنایا گیا جو کہ بتدریج ترقی کرتا ہوا تقسیم در تقسیم ہوتا ہوا بہت سے خلیات سے مختلف اعضاء بناتا ہوا ایک انسانی پیکر میں جب نمودار ہوا' تو پھر اِس کی افزائشِ نسل دو خلیات نر و مادہ سے رحمِ مادر سے ترتیب پا گئی۔لہٰذا دونوں ایک دوسرے جیسے ہیں زندگی کے بہت سارے معاملات میں۔پھر کہا کہ: **جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا** (30:21'42:11) اس نے تم میں سے تمہارے لئے زوج بنا دیئے۔زوج کہتے ہیں رفیق اور ساتھی کو۔ایسے ساتھی کہ ان میں سے ایک کی تکمیل دوسرے کے ذریعے سے ہوتی ہے۔جس کے لئے فرمایا کہ -- **بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ** (3:195)۔تم ایک دوسرے میں سے ہو۔تم میں سے کوئی بھی اکیلا مکمل نہیں کہلا سکتا۔قرآن نے عیسائیوں کے لگائے ہوئے الزام کی بھی تردید کر دی کہ عورت باعثِ لغزش بنی۔جو شیطان کے بہکاوے میں آ گئی اور آدم کو جنت سے نکلوانے کا باعث بنی۔قرآن نے وضاحت فرمائی کہ **فَاَزَلَّھُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْھَا (2:36)** یعنی شیطان نے اُن دونوں کو بیک وقت بہکایا۔ لہٰذا دونوں اِس گناہ کے برابر کے شریک ٹھہرائے گئے۔ پھر دونوں نے معافی مانگ لی اور دونوں کو معاف فرما دیا گیا۔قرآن کی رو سے دونوں ہی واجب التکریم ہیں: **وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (70:17) ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔** اس سے مراد صرف مرد نہیں ہیں۔بلکہ دونوں شامل ہیں۔

انسان کی ساری زندگی کا دارومدار توازن پر ہے۔کیا یہ ممکن ہے کہ یہ توازن صرف ایک صنف (تنہا مردوں سے یا عورتوں) کے ذریعے سے قائم ہو جائے۔جو **اَلانْسَانُ** کے آدھے حصے کو نظر انداز کر کے یہ سمجھ لیا جائے کہ معاشرے میں توازن پیدا ہو جائے تو جبھی ہمیں ہر سمت ناہمواریاں نظر آتی ہیں۔ہم نے آدھے حصے کو ہی **اَلانْسَانُ** سمجھ رکھا ہے۔پھر اس میں بھی طبقاتی تقسیم کر رکھی ہے کہ 99 فی صد لوگ تو انسانوں کی صف سے الگ ہو گئے ہیں اب صرف ایک فی صد لوگ ہی انسان رہ گئے ہیں جو کہ اوپر کے طبقے کو ظاہر کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایک خصوصیت یا برتری جو صرف عورت کو ہی حاصل ہے۔وہ ہے افزائشِ نسل یا تشکیلِ اُمت' جو صرف اُسی کی تربیت کا مرہونِ منت ہے۔یہ خصوصیت معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے' جس قسم کی قوم کی مائیں ہونگی ویسی ہی وہ قوم ہوگی۔یہی وجہ ہے قرآنِ حکیم میں قوم

کے لئے اُمت کا لفظ آیا ہے۔ اِس لفظ اُمّت کا مادہ اُمّ ہے جس کے معنی ماں کے ہیں۔ اِتنی اہم ذمہ داری کے لئے اللہ تعالٰی نے ماں کو چُنا ہے کیا اِس کی تربیت میں کمی کرنے کا مطلب قومی خود کشی نہیں کہلائے گی؟؟؟

آج کی بچی کل کی ماں ہے کیا اُس کی صحت، تعلیم، آزادی سوچ وافکار، خودمختاری اور سمجھداری سلب کرنے والے دنیا میں بلندی وعروج کا خواب دیکھ سکتے ہیں؟؟؟ یقیناً نہیں!!! بقولِ علامہ اقبال

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نا زن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت!
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق ومحبت کے لئے علم وہنر موت!

اسی زن کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی تھی۔ قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالٰی ہوتا ہے: **اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط** (4:34) معاشرے میں مردوں کے ذمہ اکتسابِ رزق کی ذمہ داری ہے، اِس لئے اُن کو اِس مقصد کے لئے زیادہ اِستعداد عطا کی گئی ہے عورتوں کو دوسری قسم کی اِستعداد دی گئی ہے۔ اِس لئے مردوں کے کمائے ہوئے رزق سے عورتوں کی ضروریات پوری کرنے کے حکم آیا ہے (**قَامَ عَلَيْهَا** معنیٰ ہیں، **مُنْفِقٌ لَهَا** یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا)۔ **فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ط** پس وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کو جس میں پرورشِ جنین بھی شامل ہے جو کہ پوشیدہ طور پر اُن کو عطا کی گئی ہے وہ اُن کو ادا کرسکیں گی۔ (تراجم یہ کئے گئے کہ نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں۔ وہ اپنی عصمت کی حفاظت مردوں کی غیر موجودگی میں کرتی ہیں گویا کہ یہ صفات **صٰلِحٰتٌ، قٰنِتٰتٌ** اور **حٰفِظٰتٌ** ہونا صرف عورتوں ہی کے لئے ضروری ہے۔ حالانکہ سورۂ احزاب کی آیات میں پہلے آچکا ہے کہ یہ خصوصیات دونوں کے لئے یکساں ہیں لہٰذا قرآن کی رو سے فرمانبردار ہونا دونوں کے لئے ضروری ہے۔ اِس اعتبار سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کیونکہ مرد اور عورت میں باہمی تعلق رفاقت کا ہے۔ رفاقت میں ایک کی حکومت دوسرے کی فرمانبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!!!

دونوں خدا کے پروگرام کے مطابق اِس کارخانے کا حصہ ہیں اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنے والے ہوتے ہیں۔ دونوں ہی ملت یا قوم کہلاتے ہیں۔ حاکم اور محکوم کے انسانی نظام کی قرآن سختی سے تردید کرتا ہے اور جنت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اعمالِ صالحہ کو قرار دیتا ہے، جو دونوں کو اپنا اپنا کردار صحیح ادا کرنے کے بعد ہی مل سکتی ہے۔ اُس میں کسی کے محض مرد پیدا ہوجانے سے قانونِ خداوندی بدل نہیں سکتا۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اب آگے بڑھتے ہیں آیت کے اگلے حصے میں تو

فیصلہ کر دیا گیا کہ فرمانبرداری نہ کرنے والی عورتوں کے ساتھ کیا سلوک شوہر کر سکتا ہے۔ یہ اِجازت نامہ تراجم سے حاصل کیا گیا۔ قرآن کے حکم میں اِس کی اجازت ہے یا نہیں یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی جاتی۔

وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ فَعِظُوۡهُنَّ وَاهۡجُرُوۡهُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ ج فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡهِنَّ سَبِیۡلًا ط اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا (4:34)۔

اور جن عورتوں سے تم ڈرتے ہو چڑھائی ان کی سے پس نصیحت کرو اُن کو اور چھوڑ و اُن کو بیچ خوابگاہ کے۔ اور مارو اُن کو۔ پس اگر کہا مانیں تمہارا تو مت ڈھونڈو اوپر ان کے راہ۔ تحقیق اللہ ہے بلند بڑا۔

جیسا کہ اِس آیت کے شروع سے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ کسی خاندانی فساد کی بات نہیں ہو رہی، نہ ہی میاں بیوی کا باہمی تنازعہ موضوعِ گفتگو ہے۔ اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ معاشرتی اُصول دے رہے ہیں جس کے تحت معاشرے میں عام مردوں اور عورتوں کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔ مردوں کا کام اکتسابِ رزق ہے اور خواتین کی ذمہ داری اندرونِ خانہ ہے۔ جس میں وہ اولاد کی پرورش، اپنی ذات میں ترقی و دیگر خوبیاں، تعلیم و تربیت جیسی سہولیات سے بہرہ مند ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ تمام بہترین مواقع کے باوجود معاشرے میں بے راہ روی کا شکار ہوں تو ان کو سمجھانے کی کوشش کی جائے ان پر نظر بندی کی سزا گھر کے اندر دی جائے یہ بھی سمجھانے کی خاطر ہوگی۔ اگر اُس کے باوجود باز نہ آئیں تو پھر **عدالت سے رجوع** کیا جائے، حد کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ جو کہ آخری حربہ ہوگا۔

قارئینِ کرام! ہم سب ہی جانتے ہیں کہ کس طرح شوہر حضرات نے اس بہانے کو آڑ بنا کر کہ بیوی نافرمان ہے وہ میرے حکم کو بجا نہیں لاتی یا میرے حکم کے مطابق میرے والدین، بہن، بھائیوں کی خدمت نہیں کرتی۔ مت پوچھیے کہ کس کس طرح اِس بے بس عورت کی مٹی پلید نہیں کی جاتی۔ کیا کسی عدالت نے یا کسی بھی جرگہ نے یہ فیصلہ کبھی سنایا کہ شوہر کے کسی حکم کو نہ ماننے کی عورت کو کتنی سزا ملنی چاہئے؟؟؟ مرد تو نافرمان تب بھی نہیں کہلاتا جب وہ اُس کا نان و نفقہ، اولاد کی ذمہ داری ہی نہیں اُٹھاتا، نہ اُس کو معاشرہ سزا دیتا ہے اور نہ مذہبی فرقے۔ وہ بلا جواز عورت کو گھر کے اندر قید یا نظر بند رکھتا ہے کہ والدین کے مرنے پر جنازے میں شریک ہونے کی اجازت بھی نہیں دیتا تو اُس وقت کون اُس مظلوم کی دادرسی کو آتا ہے۔ یہ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے، کوئی مبالغہ آرائی نہیں! کیا شوہر کا مطالبہ بھی چیلنج کیا گیا کہ وہ اُس محکوم سے کس قسم کی فرمائش کر رہا تھا اور اس کے اُن احکامات کی شریعت کہاں اجازت دیتی ہے؟؟ بالکل نہیں!!!

ہوتا یوں ہے کہ وہ عورت مار کھاتی ہے شوہر سے، اُس کے گھر والوں سے جو اپنے اپنے ظرف کے مطابق کبھی زبانی، کبھی چولھے سے جلا کر، کبھی چادر اور چار دیواری لوٹ کر، کبھی خودساختہ رسموں کی بھینٹ چڑھا کر، کاروکاری کا کھیل رچا کر

اُس کو قتل کر دیتے ہیں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی یا پھر اُس کو جینے کی سزا دیتے ہیں۔ اُس کی زندگی عذاب بنا دیتے ہیں۔ ابھی پچھلے دِنوں بلوچستان میں دو خواتین کو قتل کر دیا گیا نہ کوئی عدالت بیٹھی نہ کسی قانون کا اطلاق ہوا بس گھر کے مردوں کی غیرت کی بھینٹ چڑھا دی گئیں۔ کیا خدا اُس عورت کے لئے یہ سوال نہیں پوچھے گا کہ تمہیں کس جرم میں قتل کیا گیا؟؟؟ (**بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ** 81:9)۔ بتایئے اگر دِیگر مذاہب نے عورت کو گنہگار، وجہِ شرمندگی کہا۔ اُس کو درجۂ آدمیت سے گرا دیا تو نام نہاد اسلام کے ٹھیکیداروں نے تو اُس کی جان کو بھی قابلِ رحم نہ سمجھا۔ ایک عرصہ تک غیر مسلموں کے یہاں یہ بحث چلی کہ اُس میں روح بھی ہوتی ہے کہ نہیں جو مغرب کے مذہبی فقہاء اور مفکروں کے لئے معمہ بنا رہا۔ اُن کے نزدیک روح پاک چیز ہے لہٰذا وہ عورت میں نہیں ہو سکتی صرف مردوں میں ہوتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دینِ اسلام نے عورت کو کیا حفاظت دی؟؟؟

ہم ابھی ابھی صرف ایک آیت کے ترجمے سے پیدا ہونے والے معاشرتی فساد کا اندازہ لگا رہے ہیں جس کے تحت تو کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے بلکہ مروجہ مذہبِ اسلام نے تو غلط کاروں کو قرآن سے دلائل دے کر صحیح ثابت کر دیا ہے کہ قرآن میں تو لکھا ہے کہ اگر وہ نافرمانی کرے تو اس کو مارو لیکن تفسیر میں یہ رعایت ضرور دے دی گئی کہ دیکھنا جسم پر نشان نہ پڑنے دینا۔

بتایئے طیش کی انتہا ہوتی ہے تو جب ہی ہاتھ اُٹھتا ہے، اُس کے بعد کیا ہوگا یہ کس کو یاد رہتا ہے۔ طوفان تھم جانے کے بعد راکھ کے ڈھیر میں کوئی چنگاری رہتی ہے کہ نہیں۔ کون جانتا ہے؟؟؟ قرآنِ کریم تو ضبط و تحمل، احسان، رواداری، محبت کی تعلیمات سے عبارت ہے پھر یہ تعلیم کن ذہنوں کی پیداوار ہو سکتی ہے یہ جاننے کے لئے ہمیں پچھلے چودہ سو سال کی تاریخ میں جانا ہوگا جس کا یہ موقع نہیں!

ہماری کسی شرعی عدالت نے مرد اور عورت کے دائرۂ کار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قرآن کے فیصلے کے مطابق فیصلہ سنایا؟؟

وہ دلائل روایات سے اور فیصلے فقہی ائمہ کرام سے لیتے ہیں جس کے تحت عورت کو مرد کے تابع زندگی گذارنے میں فخر محسوس کرنا چاہیے وہ اُس کو اگر باندی کی حیثیت سے بھی رکھے تو بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ مزید تفصیلات آپکو بہشتی زیور مصنفہ اشرف علی تھانوی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے ہر صفحے پر درد کے گہرے سائے میں، اُداس اور نوحہ کناں عورت ہی نظر آتی ہے قطع نظر وہ کسی بھی سوشل کلاس، علاقے، زبان یا ملک سے تعلق رکھتی ہو۔ اپنا حق حاصل کر لینے والیاں کتنے فی صد ہیں یقیناً کم ہیں مگر زندگی کے دو پاٹوں میں پسِ جانے والیاں بے حساب ملیں گی۔ جب زبانوں پر تالے، عقل و فہم کی راہیں مسدود، تعلیم و صحت سے محروم عورت بے بسی و بے کسی کے عالم میں دوسری کلاس کے شہری کی حیثیت سے زندگی گزارے گی تو اُس کی گود سے محمد بن قاسم یا طارق بن زیاد یا

قائدِاعظم' علامہ اقبال تو پیدا نہیں ہو سکتے۔ اِن ہی غلامی کی زنجیروں میں مجبور ماؤں کی گود میں پلنے والے بچے کس قسم کی شخصیت کے حامل ہو سکتے ہیں آپ ہی بتایئے؟؟؟

قرآن کا تقاضا اپنی جگہ اٹل ہے اُس میں کسی ردوبدل کا کوئی امکان نہیں ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے کہ میں اپنے وعدوں کے خلاف نہیں کرتا۔ کیا ہمیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم تباہ حال کیوں ہیں؟؟ بقول شاعرِ مشرق علامہ اقبال۔

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حرّیتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد!
ہے مملکتِ ہند میں اِک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس' مسلمان ہے آزاد

حقوقِ نسواں کے عالمی نعرہ نے جن مسائل کو جنم دیا ہے اُن کے تحت جنسی بے راہ روی کی راہیں تو ہموار ہوگئی ہیں لیکن نظام زندگی معاشی و معاشرتی طور پر زوال پذیر ہے۔ بدقسمتی سے عورت اپنے حقوق کو بھی نہیں جانتی' لہٰذا وہ تقاضا جس حق آزادی کے لئے کر رہی ہے اُس کے تحت اُس کی اپنی ذمہ داری میں تمام مرد کے فرائض بھی شامل ہو گئے ہیں' وہ مرد کو کما کر بھی دینے لگی ہے' بچوں اور گھر کے ساتھ باقی رشتہ داروں کو سنبھالنا بھی اُسی کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا اُس کی اپنی زندگی تو مزید مشکل بن گئی ہے۔ مغرب کے معاشرے نے تو اُسے شمعِ محفل بنا کر مختلف مقامات پر سجا دیا ہے' تاکہ سامانِ دل لگی وافر مقدار میں مہیا ہوتا رہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کوئی کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہے دونوں اکیلے ہیں۔ نہ ہی والدین اور اولاد کا پرخلوص رشتہ باقی رہا' نہ بہن بھائی کی معصوم محبت۔ چونکہ بنیادی اکائی گھریلو نظام باقی نہیں رہا۔ شوہر اور بیوی کی رفاقت' محبت اور وفاداری اِس گھر کی بنیادیں ہیں جب اِن کو ہی اُکھاڑ پھینکا تو پھر معاشرے کا توازن تو بگڑنا ہی تھا۔ یہ انسانوں کا تجویز کردہ نظام کبھی انصاف کے ساتھ دونوں کو ذمہ داریاں نہیں دے سکتا۔ جیسا کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ یہ اپنا مقدمہ تک صحیح طور پر پیش نہیں کر سکتی' اِس کی پرورش تم زیورات میں کرتے ہو' جھگڑے کے وقت وہ اپنا مؤقف بھی بیان نہیں کر سکتی (43:18)۔

بتایئے جب اللہ تعالیٰ اپنی اِس مخلوق کے لئے خود فکرمند ہیں اور وہ اُس کی فطرت کو واضح طور پر خود بیان فرماتے ہیں! تو کیا وہ اِس کو انسانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے؟؟؟ نہیں ہرگز نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا!!! کیا یہ ذاتِ خداوندی پر بہتان نہیں ہے؟؟؟

قرآنِ حکیم نے عورت کو مقامِ آدمیت سے اُٹھا کر مومنات کے درجے پر فائز کیا اور ابدی خوشیوں کی بشارت دی ہے۔ اُن کے تمام جملہ حقوق محفوظ فرما کر اللہ تعالیٰ نے مرد کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ یاد رکھو کہ حق دار کو اُس کا حق ملنا چاہیے۔ یہ ذمہ داری ایک امانت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو سونپ چکے ہیں۔ اب جو بھی اِس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے ادا کرتے

ہیں وہی دنیاوی اور اُخروی جنت حاصل کرتے ہیں' انہی کی کھیتیاں پھلتی' پھولتی ہیں۔ایسے جنتی معاشرے کوصرف خدائے برتر ہی تشکیل دے سکتے ہیں' یہ اِنسانوں کے بس کاروگ نہیں ہے!!!بقول شاعر

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل، کراچی
asif.jalil1@gmail.com

حضرت انسان قرآن کے آئینے میں

(قسط ۸)

الَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَۃِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ یَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍۢ بَعِیۡدٍ (14:3)۔

جو آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی کو پسند رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں ٹیڑھ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی لوگ پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔

یہاں اس روش کا ذکر ہے کہ جو لوگ آخرت یعنی مستقبل کی زندگی پر دنیاوی یعنی مفاد عاجلہ کو ترجیح دیتے ہیں ایسے لوگ اللہ کی راہ میں روکاوٹ ڈالتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ کے قانون میں بھی کوئی گنجائش نکال سکیں جس طرح وہ مملکت کے قوانین میں نکالتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ اس ذہنیت کا بری طرح شکار ہے۔ ہر شخص کسی قسم کے قانون یا اخلاقی قدر کی پروا کیے بغیر دولت کمانے میں مصروف ہے۔ کچھ ہمارے مذہبی رہنماؤں نے انہیں ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ وہ دلی طور پر مطمئن ہیں کہ آخرت میں معافی مل جائے گی۔ ایسے لوگ گمراہی میں بہت دور تک نکل جاتے ہیں۔

وَ قَالَ الشَّیۡطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الۡاَمۡرُ اِنَّ اللّٰہَ وَعَدَکُمۡ وَعۡدَ الۡحَقِّ وَ وَعَدۡتُّکُمۡ فَاَخۡلَفۡتُکُمۡ وَ مَا کَانَ لِیَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُکُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِیۡ فَلَا تَلُوۡمُوۡنِیۡ وَ لُوۡمُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ مَاۤ اَنَا بِمُصۡرِخِکُمۡ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُصۡرِخِیَّ اِنِّیۡ کَفَرۡتُ بِمَاۤ اَشۡرَکۡتُمُوۡنِ مِنۡ قَبۡلُ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (14:22)۔

جب اور کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان کہے گا کہ اللہ نے تمہیں سچا وعدہ دیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدے کیے تھے ان کا خلاف کیا، میرا تم پر کوئی دباؤ تو تھا ہی نہیں ہاں میں نے تمہیں پکارا اور تم نے میری مان لی، پس تم مجھے الزام نہ لگاؤ بلکہ خود اپنے آپ کو ملامت کرو، نہ میں تمہارا فریادرس اور نہ تم میری فریاد کو پہنچنے والے، میں تو سرے سے مانتا ہی نہیں کہ تم مجھے اس سے پہلے اللہ کا شریک مانتے رہے، یقیناً ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

شیطان صفت انسان فیصلے کے وقت (چاہے اس دنیا میں ہو یا

آخرت میں) کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے اگرچہ جب وہ لوگوں کو گمراہ کر رہے ہوتے ہیں تو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنے ماننے والوں کو بچا لیں گے لیکن ایسا ہوتا نہیں نہ ہوسکتا ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ جتنی بھی ذہنیتوں کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے وہ تقریباً سب ہمارے معاشرے کہ عکاسی کرتی ہیں۔ ہمارے سیاستدانوں میں یہ روش عام ہے کہ جونہی وہ حکومت سے علیحدہ ہوئے یا کردئے گئے تو وہ کسی قسم کی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہوتے۔ اگر کوئی کسی کے کہنے پر کوئی غلط کام کرے تو وہ بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ لہذا کسی شخص کی بات ماننے سے پہلے اچھی طرح غور کر لینا چاہیے۔

وَ اٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ (14:34)۔

اسی نے تمہیں تمہاری منہ مانگی کل چیزوں میں سے دے رکھا ہے۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں گننا چاہو تو انہیں گن بھی نہیں سکتے۔ یقیناً انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

یہاں انسان کی اس روش کا ذکر ہے جس کے مطابق وہ اللہ کی بے شمار نعمتوں کا اعتراف نہیں کرتا اور سمجھتا یہ ہے کہ سب کچھ اس کی اپنی محنت کا نتیجہ ہے۔ ایسے لوگوں کو ظالم اور کفر کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔ کیا یہ طرز عمل اختیار کرنے والوں نے کبھی یہ سمجھا ہے کہ وہ ظلم یا کفر کا ارتکاب کر رہے ہیں؟

وَ یَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا یَکْرَهُوْنَ وَ تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْکَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰی لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ (16:62)۔

اور وہ اپنے لیے جو ناپسند رکھتے ہیں اللہ کے لیے ثابت کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹی باتیں بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے خوبی ہے۔ نہیں نہیں، دراصل ان کے لیے آگ ہے اور یہ دوزخیوں کے پیش رو ہیں۔

ہمارے ہاں بہت سے عقائد قرآن کریم کے منافی اس لئے ہیں کہ انسانوں کے ذہنوں میں اللہ کا جو تصور ہے وہ مذہبی رہنماؤں کا دیا ہوا ہے۔ کبھی کسی نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسا تصور قائم کرنے سے ہم اسے انسانوں سے بھی پست (نعوذ باللہ) مقام پر لے آتے ہیں۔ اس آیت میں اسی بات کی عکاسی نہایت احسن انداز میں کی گئی ہے کہ لوگ جو بات اپنے لئے ناپسند کرتے ہیں وہ اللہ کے لئے مختص کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تصور عام ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ معاف کر دیتا ہے۔ یہی مثال اگر کسی شخص پر منطبق کی جائے تو کیا صورت حال ہوگی۔ زید نے بکر کا مال کھا لیا ہے۔ جج صاحب کے سامنے وہ اقرار بھی کر لیتا ہے لیکن جج صاحب اسے معاف کر دیتے ہیں۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ بکر کے ساتھ انصاف ہوا ہے؟ اگر وہ بکر کی جگہ ہوتا تو اس صورت میں بھی اس کا یہی خیال ہوتا؟ اسی طرح کے بہت سے تصورات ہم نے اللہ کے بارے میں قائم کر رکھے ہیں کہ اگر کوئی انسان ویسا عمل کرے تو ہم اسے ناپسند کرتے ہیں۔

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِکَ قَرْیَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا فَفَسَقُوْا فِیْهَا فَحَقَّ عَلَیْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا

تَدۡمِیۡرًا (17:16)۔

اور جب ہم کسی بستی کی ہلاکت کا ارادہ کر لیتے ہیں تو وہاں کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس بستی میں کھلی نافرمانی کرنے لگتے ہیں تو ان پر (عذاب کی) بات ثابت ہو جاتی ہے پھر ہم اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی بھی بستی میں تباہی آتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خوشحال لوگ دولت کے نشے میں خود کو قانون سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے لاقانونیت عام ہو جاتی ہے۔ جب قانون کی گرفت کمزور پڑتی ہے تو جرائم کی شرح بڑھتی جاتی ہے اور تباہی آ جاتی ہے۔ پاکستان برسوں سے ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہے جو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

وَّ جَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ اَکِنَّةً اَنۡ یَّفۡقَهُوۡهُ وَ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا وَ اِذَا ذَکَرۡتَ رَبَّکَ فِی الۡقُرۡاٰنِ وَحۡدَهٗ وَلَّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِهِمۡ نُفُوۡرًا (17:46)۔

اور ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ اور جب تو صرف اللہ ہی کا ذکر اس کی توحید کے ساتھ، اس قرآن میں کرتا ہے تو وہ روگردانی کرتے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

اس آیت میں بھی ان لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے جو صرف قرآن کریم کو معیار قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے اور ایسا لگتا ہے کہ ان کے دلوں پر پردہ پڑ گیا ہے اور ان کے کانوں کو ڈاٹ لگ گئی ہے۔ آج بھی لوگوں کی یہی روش ہے کہ روایات اور سنے سنائے عقائد کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں لیکن صرف قرآن کریم کی بات کی جائے تو یوں مخالفت کرتے ہیں جیسے بہت غلط بات کر دی ہو۔

وَ اِذَاۤ اَنۡعَمۡنَا عَلَی الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَ نَاٰبِجَانِبِهٖ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ کَانَ یَئُوۡسًا (17:83)۔

اور انسان پر جب ہم اپنا انعام کرتے ہیں تو وہ منہ موڑ لیتا ہے اور کروٹ بدل لیتا ہے اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔

انسانوں کی اس روش کا تجربہ تو ہر کسی کو اکثر ہوتا رہتا ہے کہ جب کسی کے پاس بہت سی نعمتیں ہوں تو اس کا رویہ ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو کچھ نہیں سمجھتا اور بہت گھمنڈ میں مبتلا ہوتا ہے لیکن جب اسے کوئی تکلیف پہنچے تو ڈیپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔

وَ کَذٰلِکَ اَعۡثَرۡنَا عَلَیۡهِمۡ لِیَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَیۡبَ فِیۡهَا اِذۡ یَتَنَازَعُوۡنَ بَیۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ فَقَالُوا ابۡنُوۡا عَلَیۡهِمۡ بُنۡیَانًا رَبُّهُمۡ اَعۡلَمُ بِهِمۡ قَالَ الَّذِیۡنَ غَلَبُوۡا عَلٰۤی اَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیۡهِمۡ مَّسۡجِدًا (18:21)۔

ہم نے اس طرح لوگوں کو ان کے حال سے آگاہ کر دیا کہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ بالکل سچا ہے اور قیامت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ جبکہ وہ اپنے امر میں آپس میں اختلاف کر رہے تھے کہنے لگے ان کے غار پر ایک عمارت بنا لو۔ ان کا رب ہی ان کے حال کا زیادہ عالم

ہے۔ جن لوگوں نے ان کے بارے میں غلبہ پایا وہ کہنے لگے کہ ہم تو ان کے آس پاس مسجد بنالیں گے۔

یہاں جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ جو لوگ دوسروں پر غالب آجاتے ہیں (چالاکی یا چرب زبانی کی وجہ سے) وہ تاریخی مقامات پر مساجد اور مزار بنا لیتے ہیں کیونکہ اس طرح انہیں دولت حاصل کرنے کے بہت مواقع ملتے ہیں اور وہ ایسی جگہوں پر سرپرست بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ شاید عام لوگوں کو یہ اندازہ نہ ہو کہ پاکستان میں موجود مزاروں سے کتنی آمدنی حاصل ہوتی ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ☆ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ☆ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (18:103-105)۔

کہہ دیجئے کہ اگر میں تمہیں بتا دوں کہ باعتبار اعمال سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ ہیں کہ جن کی دنیوی زندگی کی تمام تر کوششیں بیکار ہوگئیں اور وہ اسی گمان میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس کی ملاقات سے کفر کیا، اس لیے ان کے اعمال غارت ہوگئے پس قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔

ان آیات میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ وہی عمل اللہ کے نزدیک نتیجہ خیز ہوگا جو اللہ کی ہدایت کے مطابق (جواب قرآن کریم میں ہے) ہوگا۔ اس کے سوا تمام اعمال رائگاں اور بے نتیجہ ہوں گے چاہے کوئی اپنے طور پر انہیں کتنا ہی اہم اور مقدس کیوں نہ سمجھے۔ مذہبی لیڈروں نے لوگوں کو بہت سے عمل بتا رکھے ہیں جن میں صرف زبان سے الفاظ ادا کرنا ہوتے ہیں (ثواب کی خاطر) قرآن کریم سے ایسی کوئی ہدایت نہیں ملتی کہ محض زبان سے کچھ کہا جائے۔ ایسے تمام اعمال کا قیامت کے روز کوئی وزن نہیں ہوگا۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ہر عمل کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المعارج

(آیات 1 تا 28)

عزیزانِ من! آج دسمبر 1983ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المعارج سے ہو رہا ہے۔ یہ 70 ویں سورۃ ہے۔ اس کی پہلی تین آیات یوں ہیں: سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ o لِّلْکٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌ o مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ (70:1-3) اے رسول! یہ پوچھنے والے تجھ سے اس تباہی کے متعلق پوچھتے ہیں جس کی بابت تو انہیں Warn (آگاہ) کرتا چلا آ رہا ہے کہ وہ واقعہ ہو کر رہے گی اس لیے اپنے نظام کی اصلاح کر لو۔ جب وہ تباہی آئے گی تو کوئی بھی اُسے روک نہیں سکے گا۔

آپ کو یاد ہو گا آخری پاروں کی ابتدا میں جو میں نے کہا تھا کہ ہر پارے کے وقت اس کی تکرار ضروری ہے کہ ان پاروں میں کچھ انقلابات ہیں جن کا ذکر آ رہا ہے۔ ان انقلابات کی تین نوعیتیں ہیں۔ ایک تو خارجی کائنات میں کوئی انقلابات آئیں گے۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں' نہ وہ ہمارے لائے ہوئے ہونگے، نہ ہم انہیں روک سکیں گے۔ دوسرے انقلابات وہ ہیں جو اخروی زندگی میں آئیں گے۔ وہاں کی زندگی کے متعلق بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جو قرآن کہہ رہا ہے ہمارا اس پر ایمان ہے اور انقلابات کی تیسری قسم وہ تباہیاں ہیں جو قوموں کے غلط نظام کی وجہ سے آتی ہیں لہٰذا قومی اور معاشرتی لحاظ سے ہمارا تعلق اِن انقلابات سے یقینی طور پر ہے۔ یہ ہماری ہی لائی ہوئی تباہیاں ہوتی ہیں اور ہم چاہیں تو اس نظام کو بدل کر' جن کی وجہ سے یہ تباہیاں آتی ہیں' انہیں روک سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم یہ بتانے کے لیے ان تباہیوں کے سلسلے میں اقوامِ سابقہ کی داستانیں بطور شہادت پیش کرتا ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کا غلط نظام رائج کیا تو اس کا نتیجہ یہ تباہی ہوئی' فلاں قوم نے صحیح نظام رائج کیا تو اس کا نتیجہ خوشگواری ہوا۔ وہ ان اقوام کی تباہیاں بتاتا چلا جاتا ہے۔

نوعِ انسانی کی تباہی کے تین گوشے

جن اسباب سے وہ تباہیاں آتی ہیں اگرچہ ان کی نوعتیں تو بڑی مختلف ہوتی ہیں لیکن عام طور پہ وہ تین شقوں میں تقسیم

کرتا ہے۔فرعون [1] کی ملوکیت یعنی شخصی حکومت' ایک انسان کی دوسرے انسان پر حکومت' خواہ اس کی شکل وصورت' اس کا نام' اس کا طریق' کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ پہلی چیز تو وہی ہے جس کو وہ استکبار اور استحصال کہتا ہے یعنی کسی شخص کا کسی دوسرے انسان پر حکومت کرنا۔اسے عام طور پر ملوکیت کہا جاتا ہے لیکن نام کچھ بھی رکھیے۔ایک تو یہ ہے کہ یہ غلط نظام ہے۔ دوسرا غلط نظام نظامِ سرمایہ داری ہے کہ محنت کسی کی ہو اور اس کو استحصال اور Exploit (لوٹ کھسوٹ) کر کے کوئی اور لے جائے۔ یہ وہی ہے جسے قرآن قارونیت [2] کہتا ہے' ہمارے دَور میں یا بعد کے دَور میں اسے نظامِ سرمایہ داری یا کیپٹل ازم کہا جاتا ہے اور تیسرا باطل کا نظام ہے' جسے وہ ہامان [3] کا نظام کہتا ہے' جسے مذہبی پیشوائیت کہتا ہے جو قوم کو ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اس کے راستے میں کھڑی ہو جاتی ہے کہ یہ آگے نہ بڑھنے پائیں' تو اس نے یہ تین موٹی موٹی شقیں بتائی ہیں اور کہا ہے کہ اس کے نتیجے میں یہ تباہی آتی ہے۔ تباہی کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں لیکن وہ نظام الٹ جاتا ہے' مملکتیں الٹ جاتی ہیں۔اس طرح قومیں تباہ ہو جاتی ہیں یہ ہیں وہ تباہیاں جن کا تعلق ہم سے ہے۔اس لیے جب میں ان آیات پہ آتا ہوں تو وہ جو دوسری دو تباہیاں ہیں انہیں چھوڑ کر اسی معاشرتی تباہی کی طرف آتا ہوں کہ ہمارا تعلق ہی اس تباہی سے ہے۔

آپ کو یاد ہے کہ 68 ویں سورۃ (**القلم**) میں اقوامِ عالم کی تباہیوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا تھا: **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ** (68:33)۔کسی قسم کی تباہی تم پر آئے گی تو جو حضور ﷺ کی قومِ مخاطب تھی یہ اسے بتایا کہ ان کے غلط نظام سے جو تباہیاں آئی ہیں اور جن کا ذکر ہم نے کیا ہے تمہارا نظام بھی انہی جیسا غلط نظام ہے' اس قسم کا عذاب تم پہ بھی آئے گا۔**وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ** (68:33) اور اخروی زندگی کا عذاب اس سے بھی کہیں زیادہ ہوگا۔قرآنِ کریم نے اس دنیا میں آنے

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرنگرانی)' مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء ص 109' (فٹ نوٹ نمبر 1)

[2] قارون' قارونیت اور ہامان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظوالحق (زیرنگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص 124' (فٹ نوٹ نمبر 1 اور 2)

[3] اے رسولؐ! تم ان مخالفت کرنے والوں کو بتا دو کہ قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے والوں پر اس طرح' اس دنیا میں' تباہی آیا کرتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

والے عذاب یا تباہی کی تشریح اور توضیح کی تھی۔ اس طرح یہ جو کَذٰلِکَ الْعَذَابُ (68:33) تھا کہ اسی قسم کی تباہی تم پر بھی آنے والی ہے تو اسی ضمن میں کہا کہ اب یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ تباہی کب آئے گی: تم روز ہمیں اس سے ڈراتے رہتے ہو' وارن کرتے رہتے ہو' تنبیہ کرتے رہتے ہو۔ اب بتاؤ کہ وہ عذاب کب آئے گا' جس کے متعلق تم کہتے ہو کہ وہ فی الحقیقت واقعہ ہو کر رہے گا۔ تم اس یقین کے ساتھ ان کے لیے کہہ رہے ہو جو صحیح نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔

کافر کے حقیقی معنی

یاد رکھیے کہ جب قرآن میں کافرین یا کافر کا لفظ آتا ہے تو ہمارے ذہن میں تو بس ایک ہندو آجاتا ہے' اور تو ہم کسی کو کافر سمجھتے نہیں اور وہ بھی اب وہاں انڈیا میں رہ گیا تو گویا اب تو یہاں کافر کوئی ہے ہی نہیں۔ ہم تو سب مومن ہیں۔ کافر کے معنی ہیں ''نظامِ خداوندی کی تردید کرنے والا' اس کے خلاف سرکشی کرنے والا' اس کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنے والا۔'' یہ صرف عقیدے کی بات نہیں ہے' یہ نظام کی بات ہے۔ یہ جو غلط نظام عائد کیے ہوئے ہیں اور اس پہ مصر ہیں کہ ہم اسے نہیں بدلیں گے' ان کے لیے ہے کہ وہ نظام آئے گا۔ تمہاری غلط نظام سے تباہی آئے گی۔ اس کے لیے کہا کہ لَیْسَ لَہٗ دَافِعٌ o مِّنَ اللّٰہِ ذِی الْمَعَارِجِ (70:2-3) ان سے کہو کہ جلدی نہ مچاؤ' کوئی عید کا چاند نہیں ہے' وہ جو آنے والا ہے' وہ تو تباہی ہے جب وہ آئے گی تو کوئی اس کی مدافعت نہیں کر سکے گا' کوئی اسے روک نہیں سکے گا' اس کے لیے پہلے ہی مِنَ اللّٰہِ (70:3) کہا کہ یہ خدا کی طرف سے' خدا کے قانون کی رو سے' آئے گا۔ وہ من اللہ کہہ کر یہ بتا رہا ہے۔ اب آگے ایک اور بات کہی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ویسے تو قرآن پہلے لفظ الحمد سے آخری لفظ والناس تک' پورے کا پورا' اعجاز ہے لیکن اس میں بعض ایسے مقامات آتے ہیں کہ چشمِ بصیرت غور کرتی ہے تو وجد میں آجاتی ہے۔

مہلت کا وقفہ قانونِ مکافات کا ہی حصہ ہے

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے کہ قانونِ مکافات یہ ہے کہ جس قسم کے اعمال ہوں گے' جس قسم کا نظام ہوگا' اسی قسم کے اس کے نتائج سامنے آئیں گے۔ یہ قانونِ مکافات ہے۔ یہ اٹل ہے' غیر متبدل ہے' شروع سے چلا آ رہا ہے' آخر تک چلا جائے گا لیکن ایک عمل یا نظام کے قائم ہونے اور اس کا نتیجہ برآمد ہونے کے درمیان مہلت کا ایک وقفہ ہے۔ یہ بھی اس قانونِ مکافات کا ایک حصہ ہے' ایک جزو ہے' فوری گرفت نہیں ہوتی۔ یہ وہ ہے جسے Accumulative Effect (مجموعی اثر) کہتے ہیں۔ وہ چیز بتدریج آہستہ آہستہ جمع ہوتی رہتی ہے' ہوتی رہتی ہے' تآنکہ وہ وقت آجاتا ہے کہ پھر وہ کشتی ڈوب جاتی

ہے۔ یہ قانونِ مکافات کا ایک طریق ہے' ایک جزو ہے' ایک پروگرام ہے۔

اب دیکھیے جو میں نے کہا تھا کہ بعض مقامات ایسے آتے ہیں کہ انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ یہاں کہا: مِنَ اللّٰهِ (70:3) یہ خدا کی طرف سے آئے گا۔ من اللہ کے بعد کہا ہے: ذِی الْمَعَارِجِ (70:3)۔ معارج سیڑھیوں کو کہتے ہیں یعنی یہ اس خدا کی طرف سے ہے جو سیڑھیوں والا ہے۔ یہ کتنی عجیب چیز ہے۔ اگر آپ نے چھت پہ جانا ہو تو آپ جمپ کر کے نہیں جا سکتے' آپ Step by Step جاتے ہیں' قدم بہ قدم جاتے ہیں' بتدریج جاتے ہیں۔ وہ جو کہا تھا کہ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ [1] (68:44)۔ یہ قوم تدریجی طور پر' قدم بہ قدم' اس انجام کی طرف جاتی ہے جو اس نظام کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے لیکن چڑھتی ہے قدم بہ قدم۔ اب غور فرمائیے یہی مہلت کا وقفہ ہے کہ فوری گرفت نہیں ہوتی' وہ قوم آہستہ آہستہ اس کی طرف جا رہی ہوتی ہے۔

سیڑھیوں والا خدا

اب اس عمل (Process) کے لیے کہا کہ خدا کی طرف سے' خدا کے قانونِ مکافات کی طرف سے' وہ تباہی آئے گی۔ وہ خدا سیڑھیوں والا ہے۔ قرآن کریم نے سیڑھی کا ایک لفظ کہہ کر اپنا وہ سارا' فلسفہ بتا دیا جس کے ذریعے نظام بتدریج اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ قرآن اس ایک تشبیہہ میں وہ ساری بات بتا گیا ہے اور پھر عربوں کی اِس زبان کا کیا پوچھتے ہو! وہ بھی کیا قوم تھی!

درکات اور درجات کا مفہوم

یہ جو معراج یا معارج ہیں یہ تو سیڑھیاں ہو گئیں۔ انہی سیڑھیوں سے جب کوئی اوپر چڑھتا تھا تو عرب انہی ڈنڈوں کو اوپر چڑھتے وقت درجات یا مدارج کہتے تھے اور انہی ڈنڈوں کو جب کوئی نیچے اترتا تھا تو درکات کہتے تھے۔ سیڑھی ایک ہی ہوتی ہے' آپ قدم بہ قدم بلندیوں کی طرف جائیے تو وہ درجات ہوتے ہیں جو بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی سیڑھی سے' غلط نظام کی رو سے' نیچے اتریئے تو وہ درکات ہوتے ہیں' لیکن وہ بھی سیڑھی ہوتی ہے جس پہ قدم بہ قدم آگے جایا جاتا ہے۔

---

[1] ہم انہیں بتدریج' آہستہ آہستہ' تباہی کی طرف لا رہے ہیں حتی کہ انہیں اس مقام تک پہنچا دیں گے جہاں انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ وہ تباہی آ کہاں سے گئی!

ملائکہ اور روح کی قوتیں

عزیزانِ من! آگے ہے کہ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوْحُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ ❶ (70:4)۔ ملائکہ اور روح کے متعلق پہلے آ چکا ہے کہ ملائکہ کائناتی قوتیں ہیں اور روح خدا کی اسکیم کو بروئے کار لانے والی عالم امر کی قوتیں ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ غلط نظام کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے یہ یونہی نہیں آ جاتا۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل روبعمل ہوتا ہے۔ اس کے لیے خدا کی یہ قوتیں مقرر کی ہوئی ہیں جو یہ چیزیں لاتی ہیں یا اس نظام کے اندر جو تباہیاں پوشیدہ ہوتی ہیں انہیں وہ بروئے کار لاتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ اس کے لیے قوموں کی تباہی کا بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔

پچاس پچاس ہزار سال کے دن کا مفہوم

اب یہ دیکھیے یہاں کہا ہے کہ خدا کا ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے۔ کائنات کی زندگی سائنسدانوں سے پوچھیے وہ اسے جس عدد یا جس نمبر یا جس شمارے میں بیان کرتے ہیں وہ تو ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ وہ ہوتا کیا ہے۔ وہ ایک ایسا Higher Mathematics ہے کہ وہ حساب شمار میں آتا ہی نہیں ہے۔ وہ اتنا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ یہاں تو یہ کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ بات آ گئی ہے' دو مقام اور بھی ہیں جنہیں تصریفِ آیات کی رو سے ساتھ ملانے سے' بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن کہہ کیا رہا ہے' وہ میں یہاں بیان کر دوں۔ السجدۃ کی پانچویں آیت میں ایک مقام ہے' جہاں کہا ہے کہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ❷ (32:5)۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی اسکیم کا ایسا نظام ہے کہ ایک Plan (اسکیم) ہوتا ہے۔ وہ اسکیم

---

❶ خدا کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنی اسکیم کا آغاز اس کے پست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ پھر کائناتی قوتیں (جو عالم خلق میں کارفرما ہیں) اور الوہیاتی توانائی (جو عالم امر میں روبعمل ہے) اُس اسکیم کو تکمیل تک لے جانے کے لیے اوپر اٹھتی ہیں اور اس طرح اسے ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی' آگے بڑھاتی ہیں۔ یہ مراحل بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن کی مدت ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال ہوتی ہے۔ (22:47 ; 32:5 ; 35:10 ; 78:38 ; 97:4) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ (کائنات کو مختلف ادوار و منازل سے گزار کر پیدا کرنے سے مراد کیا ہے' اسے غور سے سنو۔ اس کا طریقِ تخلیق یہ ہے کہ) اس کے عالم مشیت میں ایک اسکیم سامنے آتی ہے۔ وہ اس اسکیم کا آغاز' اُس کے پست ترین نقطہ سے کرتا ہے اور وہ (کائناتی عناصر کے باہمی تعاون سے نشوونما پاتی ہوئی' ارتقائی منازل طے کرتی جاتی ہے اور) اس طرح' آہستہ آہستہ' اس نقطۂ تکمیل کی طرف اٹھتی اور بڑھتی جاتی ہے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا تھا (35:10)۔ ان ارتقائی منازل کی مدت' تمہارے حساب شمار کے مطابق' ہزار ہزار سال (22:47) بلکہ (بعض اسکیموں کے سلسلہ میں پچاس پچاس ہزار (70:4) کی ہوتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عالمِ امر میں طے پاتی ہے۔ یہ جو عالمِ امر میں خدا کی اسکیم طے پاتی ہے وہ بتدریج نہیں طے پاتی' اس میں وقت نہیں لگتا' اس عالمِ امر کے اندر وقت کا تو شمار ہی نہیں ہوتا' وقت کا یہ شمار تو ہماری دنیا کے اندر ہے' وہاں کے عالم امر کے متعلق تو قرآن نے مختلف مقامات میں کہا ہے۔ ایک مقام پہ کہا ہے کہ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ❶ (36:82)۔

عالمِ امر اور عالمِ خلق کی حقیقت

عالمِ امر میں کیفیت یہ ہے کہ وہاں خدا کا کسی شے کے متعلق ارادہ ہوتا ہے' اس نے ہمارے سمجھانے کو کہا کہ وہ کہتا ہے ''ہوجا'' اور اس شے کی تخلیق کا آغاز ہوجاتا ہے' ورنہ یہ کوئی بھی کہنے والی بات نہیں ہے کہ خدا کو یہ کہنا پڑے: ''کن'' اور پھر وہ شے ہوجائے' اس کے بغیر یہ عمل سمجھا یا نہیں جاسکتا' چونکہ یہ گفتگو ہماری زبان میں ہوتی ہے اس لیے اتنی سی بات کہی کہ اس کا ارادہ ہوتا ہے' وہ کہتا ہے ''ہوجا'' اور اس کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اس طرح عالمِ امر میں یہ تدریجی بات نہیں ہوتی کہ وہاں آہستہ آہستہ' نقشہ بن رہا ہوتا ہے یا یہ کہ وہاں قانون بن رہا ہوتا ہے' مثلاً یہ کہ وہ قانون کہ جس کے تابع شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی ملتی ہے' اس عالم میں ضروری نہیں کہ خدا جو قانون بنا رہا ہو وہ تدریجاً بنائے' وہاں عالمِ امر میں تو یہ چیز ہے: ''کن اور فیکون'' جب وہ عالمِ امر کی اسکیم اس عالمِ خلق میں آجاتی ہے تو یہاں پھر وہ اسکیم بتدریج اپنی انتہا تک پہنچتی ہے۔ اس کا انتہائی درجہ تو اس کے لیے مقرر کیا ہوتا ہے۔ یہ کہا ہے کہ اس کا وہ امر سماء میں تیار ہوتا ہے' اس بلندی کے اوپر جو ہمارے تصور میں بھی نہیں آسکتی وہاں وہ تیار ہوتا ہے۔ یہ الفاظ محض ہمارے سمجھانے کے لیے ہیں۔ اب اس اسکیم کو عالمِ خلق میں' ہماری زندگی میں' ہماری دنیا میں لانا ہے تو وہاں سے وہ اسکیم ارض کے اوپر آجاتی ہے' جہاں وہ آہستہ آہستہ بتدریج اپنے انتہائی مقام تک پہنچتی ہے۔ وہ تعـــرج کا لفظ آگیا جس کی تشریح میں کر رہا ہوں کہ پھر وہ یہاں آہستہ آہستہ اوپر چڑھتی ہے' وہ اس طرف جاتی ہے جس عالم کے اندر وہ طے پائی تھی۔ عالمِ امر اس کا منتہیٰ ہے' وہ اسکیم اس کی طرف آہستہ آہستہ جاتی ہے۔ اوپر کی طرف جانے کے لیے ایک بات تو یہاں خدا کی سکیم کی ہو رہی تھی لیکن اوپر جانے کے لیے ایک نقشہ بڑا خوبصورت ہے یونہی ذہن میں وہ شعر آگیا:

---

❶ خدا کو تخلیق کے لیے' کہیں سے کوئی مسالہ (Material) مانگ کر لانا نہیں پڑتا۔ اس کا قانون تخلیق یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس ارادے کے ساتھ ہی اس شے کی تخلیق کی ابتدا ہوجاتی ہے۔ (ایضاً)

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا

یہ تغزل کے اندر شعر ہے۔ اس کے اندر کتنی بلندیاں ہیں: اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے۔ تو یہ جو خدا کی اسکیم ہوتی ہے' جس کی ابتدا سماء سے ہوتی ہے' وہ اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز ہوتی ہے مگر ہوتی ہے یہ بتدریج۔ یہ خدا کے ایک ایک دن میں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی' مقامِ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کا یہ ایک ایک دن تمہارے حساب وشمار سے ہزار ہزار (22:47 ; 32:5) سال کا ہوتا ہے اور پچاس پچاس ہزار سال (70:4) کا ہوتا ہے۔ یہاں سورۃ السجدۃ کی پانچویں آیت (32:5) میں تو عام الفاظ میں بات کہی ہے اور دوسرے مقام یعنی (22:47) میں آپ دیکھیے وہاں اس تباہی کے متعلق بالخصوص کہا ہے کہ وَ یَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ (22:47) یہ جلدی مچا رہے ہیں' تقاضا پر تقاضا کر رہے ہیں کہ وہ عذاب جس کی انہیں دھمکی دی جا رہی ہے' آتا کیوں نہیں' کب آئے گا؟ اس کے آنے کے لیے وہ جلدی مچا رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ (22:47) خدا کے قانون میں کبھی بھی وعدہ خلافی نہیں ہوتی' وہ ہو کر رہتا ہے' جو کہا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ یہ اٹل قانون ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جب یہ نتائج خدا کے کائناتی قانون کے مطابق مرتب ہوں تو ان کے ظہور میں دیر لگتی ہے اس لیے کہ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ [1] (22:47)۔

قوموں کی زندگی صدیوں پر محیط ہوتی ہے

اگر خدا کے ایک دن میں بھی وہ واقعہ ہو جائے تو تمہارے حساب وشمار سے اس میں ہزار سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ قوموں کی زندگی بھی دنوں اور مہینوں سے نہیں ماپی جاتی' اس کے اندر صدیاں ہوتی ہیں' وہ تو اگر زوال پذیر بھی ہوتی ہیں تو صدیاں لگ جاتی ہیں مثلاً اورنگزیب (1707-1618ء) کی موت کے بعد تباہی تک پہنچنے کے لیے اس میں بھی اس کو ڈیڑھ سو سال لگ جاتا ہے۔ تو یہاں کہا ہے کہ اس میں جلدی کی بات نہیں ہے۔ اس کی رفتار خدا کے حساب وشمار سے یوں سمجھیے کہ اگر وہ اس کے حساب سے ایک دن میں بھی واقعہ ہو تو وہ ایک دن تمہارے حساب وشمار میں ہزار سال کا بھی ہو سکتا

---

[1] خدا کے کائناتی نظام میں ایک ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے' تم لوگوں کی گنتی شمار کے مطابق' ایک ہزار سال ہو (70:4-5-32:5) (کائناتی تبدیلیاں' اور قوموں کے اموال وظروف میں تغیرات بڑے بڑے لمبے عرصے کے بعد رونما ہوتے ہیں)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے' تو گویا اس نے بتایا یہ ہے کہ یہ جو قوموں کی تباہیاں آتی ہیں وہ ایک دن میں نہیں آ جاتیں۔ تو یہ جو جلدی مچا رہے ہیں' ان سے کہیے کہ وہ واقعہ ہو کر رہے گا' یہ اٹل بات ہے۔ ''کب واقعہ ہوگا؟'' یہ خدا کے قانونِ مکافات کے حساب میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر آپ سنکھیا کھائیں تو اسی وقت موت ہو جائے اور یہ جو آج کل ہیروئین وغیرہ پی جاتی ہے' خودکشی تو اس میں بھی ہوتی ہے مگر وہ ذرا زیادہ وقت لے لیتی ہے' وہ درجہ بدرجہ ہوتی ہے۔ تو خودکشی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں جبکہ غلط نظام کی کارکردگی بھی اسی شکل میں نکلتی ہے نیز یہ کہ قوموں کی موت وحیات کا پیمانہ خدا کے حساب وشمار کے مطابق صدیوں پر محیط ہوتا ہے اور اُس کی نتیجہ خیزی میں کسی قسم کی کوتاہی کا امکان نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ چیز جسے ہم ایمان کہتے ہیں کہ خدا نے غلط نظام کا جو انجام کہا ہے' وہ یقینی چیز ہے' وہ یقیناً واقعہ ہو کر رہتا ہے۔ ''کب واقعہ ہوتا ہے؟'' اس کے لیے تو نبی اکرم ﷺ نے بھی دریافت فرمایا تھا تو جواب یہ تھا کہ یہ متعین کرنا کہ وہ کب ہوگا تمہارا کام نہیں ہے' تمہارے ذمہ عَلَيْكَ الْبَلٰغُ (13:40) اس پیغام کو پہنچاتے چلے جانا ہے۔ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) یہ حساب ہمارے ذمہ ہے کہ اس کا نتیجہ کب مرتب ہوتا ہے۔ تمہاری بے صبری کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ''ہم جنوں کیندے ناں کالے پے جانے آں۔'' [1] یہ ٹھیک ہے کہ وہ جو مظلوم بیچارہ ہے' جس کے بچے تین دن سے بھوکے ہیں' سردی میں کپڑا نہیں ہے' چھت گر گئی ہے' کوئی متبادل انتظام نہیں ہے' وہ تو اس انتظار میں کہاں رہے گا کہ ہزار سال کا عرصہ ہو گزرے تو اس ظالم کی کلائی مروڑی جائے لیکن کیا کیا جائے' وہ تو اپنے حساب سے ان تباہیوں کو لاتا ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ جو مظلوم ہے اس کے اوپر تو تباہی کا ایسا اثر نظر آتا ہے لیکن یہ بھی اس کی رحمت ہے کہ اس نے نظام یا عمل کے اس نتیجے میں وقفہ رکھا ہے تاکہ اس درمیان میں کوئی چاہتا ہے تو اپنی اصلاح کر لے لیکن بہرحال جن پہ یہ بیتتی ہے' ان کے لیے یہ بڑا مشکل ہوتا ہے: کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک' [2] وہ بیچارے تو یہ کہتے ہیں۔

صبر کا قرآنی مفہوم

لہٰذا ان تقاضوں سے مضطرب نہیں ہونا چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نبی اکرم ﷺ سے اگلی ہی آیت میں کہا گیا ہے

---

[1] جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ جلدی مچانے لگ جاتے ہیں۔

[2] آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک [غالب]

کہ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا ❶ (70:5)۔عزیزانِ من! ہم آپ تو ایک طرف رہے، نبی اکرم ﷺ کے ذہن میں بھی یہ آتا تھا کہ ''یہ کب ہوگا؟'' انہیں کہا تھا کہ ضبط کرو، برداشت کرو، استقلال سے کام لو، اِن چیزوں کو جو ہو رہی ہیں، Stead-fastly (مستقل مزاجی سے) سے کرو Bear (برداشت) کرو۔ یہاں فَاصْبِرْ ہے۔ یہ صبر بھی صَبْرًا جَمِیْلًا ہے۔حسن کارانہ انداز سے ضبط کرو۔ایک تو واویلا کرنے سے ضبط ہوتا ہے کہ کچھ بن نہیں پڑتا تو واویلا مچانے لگے۔صبر کے یہ معنی ہمارے ہاں ہیں: جب بے کسی اور بے بسی انتہا کو پہنچ جائے، کوئی ذریعہ باقی نہ رہے تو اس بے بسی کے عالم میں کہا جاتا ہے کہ ''اچھا بہن! کی کرنا ہویا، ہن صبر کر، پاویں کناوی نقصان ہووے، صبر کر۔ ❷

عزیزانِ من! یہ صبراً جمیلاً نہیں ہے۔ یہ تو اپنی بے کسی اور بے بسی کی مجبوری کا نام ہے۔قرآنِ کریم کی رو سے صبر مجبوری کا نام نہیں ہے۔قرآن میں صبر کے بنیادی معنی کچھ اور ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ عرب اس زمانے میں جو کشتیاں لے جاتے تھے وہ بادبانوں کی ہوا والی کشتیاں تھیں۔ان میں مسافر بھی ہوتے تھے اور سامان بھی ہوتا تھا۔آپ جانتے ہیں کہ اگر اس میں وزن کا توازن نہ ہو تو یہی کشتی اس طرح ڈولتی ہے کہ ڈوب بھی جاتی ہے۔اس زمانے میں دیدہ ور ملاح کرتا یہ تھا کہ جدھر سے وہ دیکھتا تھا کہ وزن کم ہے وہاں ایک بہت بڑا پتھر رکھ دیتا تھا۔وہ یہ پتھر اس لیے رکھتا تھا کہ وہ کشتی ڈولے نہیں۔ اس پتھر کو وہ صابورہ کہتے تھے۔اس طرح صبر کے معنی ہیں: ''وہ برداشت کہ جس سے قدم میں لغزش نہ آنے پائے، انسان نہ ڈولے'' کیا بات ہے فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا (70:5) کی! خدا کہہ رہا ہے کہ اِنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا o وَّ نَرٰىهُ قَرِیْبًا (70:6-7) یہ تو اس تباہی کو بہت دور دیکھتے ہیں کہ پتہ نہیں وہ کب آنے والی ہے۔ان کی نگاہوں کے سامنے وہ بے نقاب ہو کر نہیں آ رہی اس لیے یہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ آتی واتی تو کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ کہا کہ یہ اس تباہی کو بہت دُور دیکھتے ہیں مگر ہم تو اس کو بہت ہی قریب دیکھ رہے ہیں۔عزیزانِ من! یہ فرق ہے ایک مردِ دیدہ ور کی نگاہوں میں اور ایک اس مدہوش کی نگاہوں میں۔ جو استبداد اور ظلم کی مے سے مدہوش ہوگا اس کو یہ نہیں نظر آتی، بالکل یہی صورت ہوتی ہے، اور یہ جو شراب کا نشہ ہے وہ تو پوچھو نہیں کہ کیا کر دیتا ہے۔''اوئے جاندائیں سانوں۔کیا بڑکاں ماردا پیا ہوندا اے۔ ❸'' یہ ہوتا

---

❶ تم اپنے پروگرام پر حسن کارانہ انداز سے ثابت قدم رہو۔ یہ اپنے وقت پر تکمیل تک پہنچے گا۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

❷ اے بہن! اب کیا کرنا ہے۔اب صبر کر خواہ تیرا کتنا ہی نقصان ہو جائے۔بس صبر کر۔

❸ ''اوئے! کیا تو ہمیں جانتا نہیں۔'' کیسی بڑی بڑی ڈھینگیں مارتا ہے!

ہے انداز اس کا خواہ وہ تھوڑی سی ہی کیوں نہ پی ہوئی ہو۔ یہ کیفیت ہوتی ہے اس کی: ''سانوں کون پھڑ سکدا اے اوئے۔''[1] قرآن کہتا ہے کہ اِنَّھُمْ یَرَوْنَہٗ بَعِیْدًا (70:6) یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تباہی کہیں بہت دُور ہے۔

قرآن فہمی کے لیے بصیرت سے دیکھنا شرط ہے

یہ نشے میں بدمست ہے' اسے یہ چیزیں نظر نہیں آتیں' آنکھوں پر سے پردے ہٹا کے' بصیرت کے ساتھ' دیکھے تو نظر آئے مگر بصارت کے ساتھ وہ نظر نہیں آئیں اگر وہ بصیرت سے دیکھتا تو وَ نَرٰہُ قَرِیْبًا (70:7) وہ تباہی اسے سامنے نظر آ جائے گی اور یہی چیز ہے جو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ مومن کی نگاہوں سے خائف رہا کرو' وہ چیزوں کو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ جس نے قرآن کی رو سے فراست حاصل کی ہو' وہ بہت پہلے کہہ سکتا ہے۔ وہ مثلاً 1907ء میں کہہ سکتا ہے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہو گا

(اقبالؒ: بانگِ درا)

وہ قرآن سے یہ بصیرت حاصل کرتا تھا'[2] قرآن کہتا ہے کہ وَ نَرٰہُ قَرِیْبًا[3] (70:7)۔ خدا ہی نہیں دیکھتا جو خدا کی روشنی میں دیکھتا ہے اور خدا کی روشنی قرآن ہے' جو قرآن سے فراست حاصل کرتا ہے' اسے یہ بات قریب نظر آ جاتی ہے کہ اس غلط نظام کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہا کہ اس نظام سے وہ جو تباہی آئے گی اس میں ہوگا کیا؟ پھر بتایا کہ یَوْمَ تَکُوْنُ السَّمَآءُ کَالْمُھْلِ o وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ[4] (70:8-9) کیا بات ہے! اس دن کے لیے اب یہاں سماء اور جبال کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ وہی ہے جو میں نے کہا ہے کہ یہاں اس کے مجازی معنی لیے جائیں گے۔ ان کے ہاں ''یہ جو سرکڈ جنوں

---

[1] اوئے! کس کی ہمت ہے کہ ہمیں پکڑ لے۔ پکڑ کر تو دیکھے۔

[2] یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبال (1938-1877) مفکر قرآن کی طرف ہے۔

[3] ہم اسے بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔

[4] اس وقت اِن بڑے بڑے فلک نشیں سرداروں کی قوتیں پگھل کر پانی ہو جائیں گی۔ تمام سرفرازیاں اور سربلندیاں پست ہو جائیں گی (55:37)۔ اور یہ جو اس وقت پہاڑ کی طرح جمے ہوئے نظر آتے ہیں' (دھنی ہوئی) اُون کی طرح فضا میں اڑتے دکھائی دیں گے (101:5) اور شاخِ شکستہ کی طرح خمیدہ ہو جائیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)۔

اسی کیندے آں نا پنجابی اچ'' [1] یوں طرے باز خان اکڑ کے چلنے والا جیسے وہ اوپر والا خدا ہے' اسے وہ جبال کہتے تھے۔

بات طرے کی نہیں' بات تو قد کی ہے

قرآن نے کہا ہے کہ تو اتنا اکڑ کے چلتا ہے' کیا تو آسمان کو پھاڑ دے گا' زمین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟ جتنا تیرا قد ہے اس سے تو تو ایک انچ بھی اوپر نہیں ہوسکتا۔ تیری یہ جوتے کی ایڑیاں یا طُرّے کی بلندیاں تو یونہی ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ اصل ہے تو قد ہے تمہارا۔ کیا بات ہے! کہا کہ یہ جو سماء بنے پھرتے ہیں' کس طرح سے وہ پگھل کر پانی ہو جائیں گے! اس پگھل جانے کے لیے اس آیت میں قرآن کریم نے مھل (70:8) کا ایک لفظ استعمال کیا ہے' جو بڑا ہی غور طلب ہے۔

جہنم میں کسی کو باہر سے دھکا دینے کی ضرورت نہیں پڑتی

دوسری جگہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ یہ بت برف کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب تک سورج نہیں نکلتا ان کا وقار قائم ہوتا ہے' دھوپ پڑتی ہے تو خود پگھل کے رہ جاتے ہیں۔ یعنی کسی شے کا ایسا ہونا کہ وہ خود پگھل کے رہ جائے' یہ اس لفظ ''مھـــل'' کے معنی ہیں۔ کہا کہ اس کے اندر یہ تباہی موجود ہوتی ہے' اس کے لیے کسی کو باہر سے دھکا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اقبالؒ (1877-1938) نے تو انداز ہی اور اختیار کیا ہے۔ کہا:

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خدا ست

یہ جو خدائی کے دعویدار ہیں' جب تک ان کے سامنے جھکے رہو' اس وقت تک ان کی خدائی قائم رہتی ہے۔

چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

جونہی تو کھڑا ہو گیا' یہ ختم ہو جائیں گے۔ یہ ہے تَکُوْنُ السَّمَآءُ کَالْمُھْلِ (70:8)۔ کیا خوبصورت تشبیہات ہیں قرآن کی!

خدائی کے دعویدار یہ پہاڑ اور یہ چٹانیں بالکل ختم ہو جائیں گی

عزیزانِ من! اندازہ لگائیے۔ میں تو جب ان الفاظ پہ آتا ہوں تو آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لیے تو پچاس سال ہو گئے اتنی سی کتاب کو لیے ہوئے بیٹھا ہوں۔ کہا کہ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ (70:8) اور یہ چٹانیں جو تمہیں

---

[1] جسے ہم پنجابی زبان میں ''سرکڈ'' یعنی فلک نشیں سردار کہتے ہیں۔

پہاڑوں کی طرح نظر آتی ہیں' یہ اڑتی ہوئی' اون کی طرح' دھنکی ہوئی روئی کی طرح' ہو جائیں گی۔ نگاہ ڈالیے جو بڑے بڑے طرہ بازوں اور بڑے بڑے چٹانوں کے پہاڑوں کی طرح تھے وہ کس طرح برف کی مانند پگھلتے ہیں' اون اور دھنکی ہوئی روئی کی طرح فضا میں اڑتے ہیں۔ پھر کہا کہ وَلَا یَسۡـَٔلُ حَـمِیۡمٌ حَمِیۡمًا (70:10) وہ جو ان کے عہدِ اقتدار میں ان کے بڑے ہی گہرے دوست نظر آتے ہیں' (گرمجوش حمیم کے معنی ہیں' گرمجوش دوست جو نظر آتے ہیں) اس دن وہ ان کو پکارے گا' وہ جواب تک نہیں دیں گے۔ وہ اُن کے دوست نہیں تھے وہ تو ان کے اقتدار کے دوست تھے' وہ تو اکٹھے مل کر شراب پیا کرتے تھے' جب وہ ختم ہوگئی تو دوستی کاہے کی؟ انہیں کوئی نہیں پوچھے گا' وہ آوازیں دے گا وہ جواب نہیں دیں گے: یُبَصَّرُوۡنَهُمۡ ؕ یَوَدُّ الۡمُجۡرِمُ لَوۡ یَفۡتَدِیۡ مِنۡ عَذَابِ یَوۡمِئِذٍۭ بِبَنِیۡهِo وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِیۡهِo وَفَصِیۡلَتِهِ الَّتِیۡ تُـٔوِیۡهِ ❶ (70:11)۔

عزیزانِ من! شیکسپئر (Willam Shakespeare: 1564-16161) نے بھی ڈرامے لکھے۔ جب اُس کے قریب ترین دوست' جو اس کا وفادار بنا پھرتا تھا' نے ایک چوٹ لگائی تو وہ چیخ اٹھا! You too Bruce' اے بروس! تم بھی!!! یہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ جو اسے اپنے زعم میں نہایت قریبی دوست نظر آتے تھے وہ اس سے کہے گا مگر وہ اس کی بات کا جواب نہیں دے گا۔ اس دن وہ مجرم چاہے گا کہ وہ اس عذاب سے چھوٹ جائے اور اس کے کفارے میں' فدیہ میں' اپنی جگہ' (دیکھیے قرآن نے عذاب کی شدت کن الفاظ میں بیان کی ہے)' چاہے گا کہ میرا بیٹا میری جگہ آکے پھانسی پہ چڑھ جائے' میری بیوی آجائے' میرا بھائی آجائے' میرا کنبہ' میرا خاندان آجائے۔ عزیزانِ من! فرمانِ خداوندی ہے کہ اس وقت نہایت قریبی دوست بھی پکارنے پر کوئی جواب نہیں دے گا اور مجرم اس دن چاہے گا کہ وہ اس عذاب سے چھوٹ جائے۔ وہ یہاں تک چاہے گا کہ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ثُمَّ یُنۡجِیۡهِ (70:14) جتنا کچھ زمین میں میرے پاس ہے' جتنا کچھ ملک میں میرے پاس ہے' میں وہ سارا کچھ دینے کو تیار ہوں' بس کسی طرح اس عذاب سے چھوٹ جاؤں۔

---

❶ حالانکہ وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ وہ کس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اور مجرمین اپنے ان دوستوں کو دیکھ رہے ہوں گے کہ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر مجرم چاہے گا کہ وہ کسی اور کو اپنی جگہ فدیہ کے طور پر دے کر' خود اس عذاب سے چھوٹ جائے۔ اپنے بیٹے' بیوی' بھائی یا دیگر خویش قبیلے کے لوگوں کو جن کی خاطر اس نے دیانت و امانت کے سب اصول بالائے طاق رکھ دیئے تھے اور وہ اس کی پشت پناہ بننے کے مدعی تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لفظ ''کلا'' کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ میں اس کا ایک ہی جواب ہوگا: کَلَّا (70:15) یہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ عربی زبان میں بڑے زور کا لفظ ہوتا ہے یعنی یہ نہیں ہو سکے گا۔ اِنَّھَا لَظٰی (70:15) ایسی تباہی کی آگ' تو شعلے مار کے' دُور دُور تک جایا کرتی ہے۔ اِس سے کون بچ سکتا ہے۔ اس لیے وہ اس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے بچ نہیں سکے گا کیونکہ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی [1] (70:16)۔ عزیزانِ من! یہ بڑے عجیب لفظ ہیں' ان کے معنی ہوتے ہیں: ''انسان کی توانائیاں کسی طرح سے کھینچ کے باہر نکال لی جائیں اور یوں اس کو کمزور کر دیا جائے۔'' اس عمل (Process) کے لیے یہ الفاظ آتے ہیں' بالکل اسی طرح جیسے سرنج سے کوئی خون نکال لیتا ہے۔ اس سے اس کا پیکر تو وہی رہتا ہے اور شاید وزن بھی وہی رہتا ہے مگر اندر سے کمزور ہو جاتا ہے۔ اس طرح اندر کی توانائیوں کو اس طرح سے کھینچ کے نکال لینا اور اس طرح اس کو کمزور کر دینا نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی ہے۔

تباہی و بربادی کا دوسرا نام ہی تو جہنم ہے

عزیزانِ من! کس کس شکل میں قرآن تباہیوں کے منظر پیش کرتا ہے۔ اب اس منظر کو سامنے رکھیے۔ اس کا نام جہنم رکھ لیجیے' اس کا نام تباہی رکھ لیجیے' اس کا نام عذاب رکھ لیجیے۔ پھر کہا کہ وہ تباہی' جہنم یا عذاب کچھ دُور نہیں: تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰی [2] (70:17) وہ تو آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے: کہا جا رہا ہے اوہ' چلو' چلو ان چیزوں کو بیان کرنے کے لیے۔ قرآن کا انداز محاکاتی ہوتا ہے۔ یہاں کہا کہ وہ تباہی آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کن کو؟ کہا: ان کو جنہیں صحیح نظام کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو وہ اس سے اعراض برتتے تھے' پیٹھ موڑ کے چل دیتے تھے' یہ انہیں آوازیں دے رہی ہے کہ جاؤ' دیکھو' ادھر آؤ۔

آخر یہ تباہی و بربادی کیوں؟

عزیزانِ من! یہاں رک کر ذرا سوچیے گا' غور کیجیے گا کہ یہ تباہیاں کس قسم کی ہوتی ہیں اور قرآن انہیں کن الفاظ میں

---

[1] وہ انسان کی تمام قوتوں کو کھینچ کر نکال باہر کرے گا اور اس طرح اُسے عضوِ معطل بنا کر رکھ دے گا۔ (ایضاً)۔

[2] وہ تو آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے ہر اس شخص کو جو اس نظام کی طرف سے منہ موڑ کر بھاگتا ہے اور گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

بیان کرتا ہے' اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے' تشبیہات اور استعارات میں اس سے مقصد کیا ہوتا ہے۔ آپ کچھ بھی مفہوم لے لیجیے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے اس کی شدت کا ہم پہ اثر ہوتا ہے۔ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ تباہی کیوں آتی ہے اور کس نظام پہ آتی ہے۔ ہمیں یہاں پہنچ کر رکنا چاہیے کیونکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے ہی یہ سب کچھ کہا گیا ہے۔ یہ یوں ایک پرانی داستان نہیں ہے جسے قرآن بیان کر رہا ہے۔ قرآن نے جہاں یہ تباہیاں بیان کی ہیں' اس کے آگے اس نے بتا دیا ہے کہ یہ کس قسم کے نظام کا نتیجہ ہے' کون لوگ ہیں جن کی وجہ سے یہ تباہیاں آتی ہیں۔

جمع فاوعی کا مفہوم

عزیزانِ من! اس آیت کے فوراً بعد' اگلی ہی آیت میں' پھر وہی بات ہے جو مجھ سے بار بار کہا جاتا ہے کہ تم تو جب بھی بات کرتے ہو' روٹی کے مسئلے پہ آ جاتے ہو۔ میں نہیں آ جاتا۔ کیا کروں؟ کیا میں قرآن کی ان آیتوں کو چھوڑ دیا کروں؟ سنیے! کس کس کے لیے یہ تباہی آتی ہے؟ کہا ہے کہ یہ اُس نظام کے لیے ہے یا اُس شخص کے لیے ہے جو وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (70:18) مال و دولت کو سمیٹتا چلا جاتا ہے' اکٹھا کرتا چلا جاتا ہے' اور اکٹھا کرنے کے بعد تھیلی میں ڈال کر اس کا منہ اوپر سے کس کر باندھ دیتا ہے' تجوریاں بھرتا چلا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! پھر اس کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کے لیے دوسرا لفظ عجیب ہے: کسی چیز کو برتن میں رکھ کر اس کے اوپر ایسا ڈھکنا دیدینا کہ وہ وہاں سے نکل نہ سکے۔ یہ دو لفظ ہیں' عزیزانِ من! ''جمع'' پہلی چیز تو یہ ہے کہ سمیٹتے چلے جانا اور اگلی چیز یہ ہے کہ وہ کسی اور تک پہنچنے ہی نہ پائے' اس طرح سے ڈھک کے رکھ دینا' باندھ کے رکھ دینا۔ یہ نظام سرمایہ داری کے لیے کس قدر برجستہ تشبیہہ ہے: جَمَعَ فَاَوْعٰی (70:18)۔ کہا: یہ اس لیے ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا [1] (70:19)۔ عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے کہ اس کو اس کی بڑی ضرورت تھی۔ ایک چیز اصولاً یاد رکھیے! اگر قرآن کے درس کے آپ کہیں نوٹس رکھتے ہیں تو یہ نوٹس بھی رکھ لیجیے کہ قرآن میں جہاں جہاں انسان کی الگ بات کہی ہے کہ انسان ایسا ہے' انسان ایسا ہے' انسان ایسا ہے' اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر اس کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے' وہ وحی خداوندی کی راہنمائی میں نہ چلے' اپنی مرضی کے مطابق چلے' تو وہ ایسا ہوتا ہے اور پھر وہ حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے' ظالم ہوتا ہے' جاہل ہوتا ہے' تباہ ہوتا ہے' اسے ہوس ہوتی ہے' تکبر ہوتا ہے۔ انسان کے ساتھ یہ ساری چیزیں اس کے اندر رکھیں۔

---

[1] (ذرا غور کرو کہ انسان جب وحی کی راہ نمائی چھوڑ کر' حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے تو) وہ کس قدر تنگ دل' بھوکا اور بے صبرا ہو جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی

یہیں سے ہمارے ہاں یہ چیز نکل آئی ہے کہ صاحب! یہ جمع کرنا اور گرہ مار کے رکھنا تو انسان کی فطرت میں ہے۔ ایک فطرت کا لفظ کہیں سے لیا اور اس پر یہ ساری عمارت تعمیر کر دی۔ یاد رکھیے! انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ فطرت وہ شے ہوتی ہے جو بدل نہ سکے، جس کے بدلنے کا اسے اختیار نہ ہو جسکی وہ فطرت ہے۔ مثلاً پانی کی فطرت ہے: بہاؤ کی طرف جانا۔ یہ پانی کے بس میں ہی نہیں ہے کہ وہ چڑھائی کی طرف جائے۔ آگ کی فطرت ہے: حرارت بہم پہنچانا۔ وہ اس کو بدل نہیں سکتی۔ بکری کی فطرت ہے: گھاس کھانا۔ وہ گوشت نہیں کھا سکتی۔ شیر کی فطرت ہے: گوشت کھانا۔ وہ گھاس نہیں کھا سکتا۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ یہ شیر بھی بن سکتا ہے، یہ بکری بھی بن سکتا ہے، یہ آگ بھی بن سکتا ہے، یہ پانی بھی بن سکتا ہے۔ اس کے اندر یہ تمام صلاحیتیں ہیں۔ اگر ان صلاحیتوں کو کنٹرول میں نہ رکھا جائے، اگر اس سیلاب کے پانی کو ساحلوں کے اندر محدود نہ کیا جائے تو پھر یہ طوفان اور سیلاب بن جاتا ہے۔ تو جہاں بھی قرآن میں انسان آئے گا، صرف الانسان یا انسان تو سمجھ لیجیے کہ وہ انسان ہے جو وحی کی راہنمائی میں اپنا Discipline (نظم ونسق) قائم نہیں رکھتا، جو سیلاب بن جاتا ہے اور اسی انسان کے متعلق جب یہ کہا جائے گا کہ یہ وحی کی روشنی میں چلتا ہے تو پھر وہ مردِ مومن ہو جاتا ہے۔ یہاں کہا کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (70:19) اگر انسان کو ایسے ہی چھوڑ دیا جائے تو یہ حیوانات سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ یعنی اس کی ہوس کی تسکین ہی نہیں ہوتی۔ یہ بالکل صحیح بات ہے۔ کہا کہ یہ جو جمع کیے جا رہا ہے اور تجوریوں میں بند کیے چلا جا رہا ہے تو یہ نہیں ہے کہ اسے اس کی ضرورت ہے۔ اس کے یہ جتنے بھی جمع کرنے والے اور بندر کھنے والے ہوتے ہیں وہ Capitalists (سرمایہ دار) ہیں۔ ان کی ضرورت کا تو پوچھیے نہیں! ان کی تو آخر میں جا کر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ دو روٹیاں جو ایک غریب مزدور کھاتا ہے، یہ وہ بھی نہیں کھا سکتا۔ میں نے ایسے دیکھے ہیں لیکن اس پہ بھی اس کی کیفیت یہ ہے کہ جمع کیے چلا جا رہا ہے اور پھر هَلُوْعًا (70:19) بہت زیادہ تنگ دل، بھوکا اور بے صبرا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا o وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا [1] (70:20-21)۔ اسے محاکاتی

---

[1] اس کی بے صبری کا یہ عالم ہے کہ ذرا سی تکلیف پہنچے تو واویلا مچانا شروع کر دیتا ہے۔ تنگ دل ایسا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ''ہے نہیں، ہے نہیں'' کی رٹ لگاتا رہتا ہے۔ اور نیت کا بھوکا ایسا کہ جب مال و دولت ہاتھ آ جائے تو وہ اس کی ضرورت سے کتنا ہی وافر کیوں نہ ہو، اس میں سے ایک پائی بھی کسی ضرورت مند کو نہیں دیتا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)۔

انداز میں یوں کہیے کہ کہیں کاروبار میں ذرا سا نقصان ہوا: کہا کہ بیڑہ غرق ہوگیا۔ اب ماتم ہو رہا ہے' افسردہ ہو کے بیٹھے ہیں کہ کیا ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ صاحب! توقع یہ تھی کہ اس سے دس لاکھ بچے گا' اب ایک ایسا جھٹکا لگا ہے: وہاں امریکہ میں ڈالر کی قدر و قیمت کم ہوئی ہے' وہ دس کی بجائے پانچ رہ گیا۔ صاحب! بیڑہ ہی غرق ہوگیا۔ اور جب یہ چیز آتی ہے تو دیکھیے قرآن نے کیا لفظ استعمال کیا ہے: مَنُوْعًا (70:21) پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ کوئی اس کے پاس نہ پھٹکنے پائے' کوئی لینے والا' مانگنے والا' کوئی ضرورت والا' کوئی احتیاج والا اس کے راستے میں نہ آ جائے' رکاوٹیں ڈال کر اس کو بند رکھتا ہے' وہ اس کے اوپر ڈھکنا دیدیتا ہے۔

ھلوعاً کا مفہوم

عزیزانِ من! وحی خداوندی کے تابع نہ چلنے سے انسان کی حالت حیوان سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ حیوان ''هَلُوْعًا'' (70:19) تنگ دل' بھوکا اور بے صبرا نہیں ہوتا۔ ایک بیل کے آگے کُھرلی میں کتنا ہی چارہ آپ ڈال دیجیے' وہ کھاتا ہے' جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو کتنا ہی چارہ باقی ہو وہ چھوڑ دیتا ہے' آرام سے بیٹھ جاتا ہے آنکھیں بند کر کے سر ہلاتا ہے' پھر جگالی کرتا ہے۔ کس مزے میں جگالی کرتا ہے! اسے اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ باقی چارہ کون لے جاتا ہے۔ وہ اپنی بھوک کے مطابق کھاتا ہے۔ اس کے برعکس انسان ھلوعاً ہے: بھوک کے لیے نہیں کھاتا' ہوس کے لیے جمع کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے کہا تھا کہ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (7:179) یہ انسان نہیں' حیوان ہے۔ اور آگے کہا ہے: یہ تو ان سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے' ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ ہے۔ یہ تو اس بیل سے بھی گیا گزرا ہے جو باقی چارے کے متعلق نہیں سوچتا کہ کون لے جاتا ہے۔ کوئی دوسرا بھوکا بیل آ جائے تو وہ کھائے گا' وہ اس کو سینگ تک نہیں مارتا مگر حضرتِ انسان هَلُوْعًا (70:19) واقع ہوا ہے۔

ھلوعاً کی مہلک بیماری سے کون بچتے ہیں؟

اس انسان کی کیفیت جَزُوْعًا (70:20) ہے۔ اس میں بے صبرا پن ہے۔ ''ہے نہیں ہے نہیں'' کی رٹ لگاتا ہے۔ آگے سنیے' عزیزانِ من! کہ کون لوگ ہیں جو ایسا نہیں کرتے' کون ہیں جو اس سے بچتے ہیں۔ کہا کہ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ (70:22) البتہ وہ لوگ ایسا نہیں کرتے جو مصلی ہیں۔ اب مصلی کا ترجمہ ہو جائے گا کہ نمازی ایسے نہیں ہوتے۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے جو میں کہہ رہا ہوں؟ عزیزانِ من! ذرا سمجھیے پھر اس کے اوپر ہنسیے گا۔ بات بڑی دُور چلی جائے گی۔ قرآن کہتا ہے

کہ مصلین ایسے نہیں ہوتے۔ آپ کے ذہنوں کے اندر قطار در قطار وہ نمازی آ جاتے ہیں جو اس سے بھی زیادہ بدتر ہوتے ہیں۔ اس کے پھر کیا معنی ہوئے۔ کیا آپ اس نتیجے پہ پہنچو گے کہ خدا نے (معاذ اللہ) غلط کہہ دیا ہے کہ مصلین ایسے نہیں ہوتے' ہم نے تو دیکھے ہیں کہ مصلین ایسے ہی ہوتے ہیں۔

یہ مصلین نہیں' یہ نمازی ہیں

عزیزانِ من! ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ خدا تو غلط نہیں کہے گا۔ اُس نے کہا ہے کہ ہم غلط نہیں بیان کرتے۔ تو یہ کیا بات ہوئی۔ یہ مصلین نہیں ہیں جنہیں آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ نمازی ہیں۔ صلوٰۃ کے متعلق تو اس نے خود قرآنِ کریم میں کہہ دیا تھا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ❶ (29:45)۔ عزیزانِ من! یہاں لفظ فحشا ہے فحش نہیں ہے۔ فحشا بخل کو کہتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ صلوٰۃ معاشرے سے بخل کو اور بُری چیز کو روک دیتی ہے۔ جو صلوٰۃ یہ کرتی ہے وہ خدا کی قائم کردہ صلوٰۃ ہے' جو یہ نہیں کرتی ہے وہ صلوٰۃ نہیں ہے' وہ نماز ہے۔ اب اگر آپ کا جی ہنسنے کو چاہتا ہے تو اس میں یہ امتیاز کر لیجیے کہ آپ یہ بات موجودہ نمازیوں کے متعلق کہتے ہیں' اور خدا مصلین کے متعلق یہ بات کہتا ہے۔ یہ چیز ہنگامی نہیں ہے کیونکہ اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ ❷ (70:23)۔

صلوٰۃ ایک نظام کا نام ہے

عزیزانِ من! صلوٰۃ ایک نظام کا نام ہے۔ صلوٰۃ کے بنیادی معنی ہیں ''کسی کے پیچھے پیچھے' مسلسل اور متواتر' ایسے چلے جانا کہ اس میں اور تم میں فرق نہ ہو لیکن رہو پیچھے۔'' اس نظام میں آگے آگے خدا جا رہا ہے اور اس کے پیچھے مسلسل و متواتر مصلین چلے جا رہے ہیں اور کہا کہ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ❸ (11:56) جب تم دعا مانگتے ہو کہ ہمیں صراطِ

---

❶ یقیناً نظامِ صلوٰۃ لوگوں کو ان کی اس روش سے روک دے گا جس کی رو سے' ہر فرد سب کچھ اپنے لیے سمیٹنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور دوسروں کی پرورش کا خیال کسی کو نہیں آتا اور اس مقصد کے حصول کے لیے' عقل خود بیں کی فریب کاریاں' انہیں عجیب عجیب طریقے سمجھاتی رہتی ہیں (70:21-27)۔

❷ وہ لوگ (مصلین) جو اپنے انفرادی مفاد کے پیچھے چلنے کے بجائے' خدا کے نظامِ ربوبیت کے پیچھے چلتے ہیں اور اس روش پر نہایت ہمت اور استقلال اور التزام اور مداومت سے قائم رہتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ میرا خدا' (حق و عدل کی) سیدھی اور توازن بدوش راہ پر ہے۔ [لہٰذا تم بھی' اس کے پیچھے پیچھے' اسی راہ پر چلو (1:5)۔] (مفہوم القرآن۔ پرویز)۔

مستقیم پہ چلاتو یادرکھو! تمہارا خدا صراطِ مستقیم پہ جارہا ہے' اس کے پیچھے پیچھے چلتے چلے جاؤ۔ یہ صلوٰۃ ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وہ مصلین اس پر دَآئِمُوْنَ (70:23) ہیں۔ ہنگامی طور پہ نہیں ہے کہ کسی وقت یہ ہوگیا' کسی وقت نہیں ہوگیا' یہ تو ایک نظام ہے جسے مسلسل قائم رکھنا ہے' مسلسل اس کے اوپر چلتے چلے جانا ہے۔

عزیزانِ من! یہ جو مصلین کی چیز ہے اس کی تشریح قرآنِ کریم نے سورۃ الماعون میں کی ہے۔ یہ سورۃ 107 نمبر ہے اور کئی دفعہ درس میں آ چکی ہے۔ پھر سن لیجیے کہ وہ صلوٰۃ کیا ہے اور وہ مصلی کیا ہے؟ کہا کہ اَرَئَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (107:1) تم نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا جو زبان سے تو اس کا اقرار کرتا ہے کہ وہ دین اسلام پر ہے اور عملاً اس کی تکذیب کرتا ہے؟ اس کا عمل کہہ رہا ہوتا ہے کہ یہ دین اسلام کی تکذیب کر رہا ہے' اس کا عمل دین کو جھٹلا رہا ہے۔ یہ کون ہے؟ کہا کہ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ o وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (107:2-3) یہ وہ ہے جو ان لوگوں کو جو معاشرے میں تنہا رہ جاتے ہیں' بے یار و مددگار رہ جاتے ہیں' دھکے دیتا ہے' جو بھوکے رہ جاتے ہیں ان کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔ یہ ہے جو دین اسلام کی تکذیب کرتا ہے' دین کی تکذیب کرتا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ نہیں صاحب! میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں' بڑے اہتمام سے پڑھتا ہوں' بلکہ تہجد بھی پڑھتا ہوں' اشراق بھی پڑھتا ہوں' مجھے کیا کہہ رہے ہیں آپ کہ میں دین کی تکذیب کرتا ہوں۔ قرآنِ کریم ان کے لیے کہتا ہے کہ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ (107:4) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے۔ ان نمازیوں کی تباہی ہے۔ اور آگے بتا دیا کہ خود ہی تاویلات نہ کرنے لگ جانا کہ کونسی تباہی ہے۔ انہیں اس کا پتہ ہی نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ ان لوگوں کے لیے کہا کہ اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ o الَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآئُوْنَ (107:5-6) یہ وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو سجدہ رکوع سجود ہے جو لوگ دیکھ سکتے ہیں یہ نماز ہے' وہ اس نماز کے ان حرکات وسکنات کو تو نماز سمجھتے ہیں مگر نماز کا جو مقصد ہے یہ اُسے پسِ پشت ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ نماز تو پڑھ رہے ہیں' مولوی صاحب کہہ رہے ہیں کہ تمہاری نماز ہوگئی' بالکل ٹھیک ہے کہ تمہارا پاجامہ ٹخنوں سے اوپر تھا' نماز قبول ہوگئی۔ تو یہ کیا بات ہے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ صلوٰۃ نہیں ہے' ان کی تباہی ہے۔

رزق کی تقسیم بہتے پانی کی طرح ہونی چاہیے

عزیزانِ من! یہ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے صلوٰۃ کے مقصد کو نظر انداز کر دیا۔ اس سے اعراض برت لیا تو تباہی آ گئی۔ کہا کہ ان کی اس خود فریبی کا نتیجہ یہ ہے کہ وَ یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) خدا کا وہ رزق جسے بہتے پانی کی طرح جانا چاہیے تھا

اس کو بندلگا کے روک لیتے ہیں۔ وہ یہ نماز پڑھتے ہیں' فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ❶ (107:4-5)۔ وہ یہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں تو قرآن ہی پیش کرتا ہوں۔ یہاں کہا ہے کہ مصلین ایسے نہیں ہوتے۔ جیسا پہلے کہا گیا تھا کہ وہ ایسے نہیں ہوتے ایسے تو یہ نمازی ہوتے ہیں۔ ان کی هلوعًا والی بات ہوتی ہے: تنگ دل' بھوکے اور بےصبرے۔ ان میں تو جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ❷ (104:2) والی بات ہوتی ہے۔ یہ بات مصلین میں نہیں ہوئی وہ تو عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (70:23) اپنی صلوٰۃ پر نہایت ہمت' استقلال' التزام اور مداومت سے قائم رہتے ہیں۔ دیکھیے! دائمون کوئی ایسی چیز ہے جس پہ مستقل طور پر رہنا ہے۔ ان مصلین کے بارے میں اگلی بات یہ کہی کہ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ o لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70:24-25) یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے مال میں ہر اس شخص کا حق ہے جس کا اپنی کمائی سے گزارا نہیں ہوتا' وہ محتاج ہو گیا ہے جس کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہے' اس کے مال میں ان کا حق ہے۔

خیرات تو انسان کو نفسیاتی طور پر تباہ کر دیتی ہے

قرآن کے نظام کی کیا بات ہے! اسے خیرات نہیں کہا۔ خیرات سے تو نفسیاتی طور پہ دینے والے اور لینے والے دونوں کی تذلیل ہوتی ہے۔ یہ نفسیاتی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس سے لینے والے کے اندر Inferiority Complex (احساسِ کمتری) پیدا ہو جاتا ہے' وہ اپنے آپ کو نیچ Feel (محسوس) کرتا ہے۔ دینے والے کے دل کے اندر ایک تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''صدقے اور خیرات سے دل مر جاتا ہے۔'' یہ

---

❶ کام تو ایسے کرتا ہے لیکن اپنے آپ کو ''دیندار'' ظاہر کرنے کے لیے نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ اسی قسم کے نمازی ہیں جن کی نمازیں ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں اس لیے کہ یہ نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں (یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں) کہ یہ بڑے متقی پرہیزگار ہیں۔ انہیں اس کا پتہ نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے۔ اس کا مقصد تھا ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد قوانین خداوندی کا اتباع کریں اور عالمگیر انسانیت کو سامانِ نشوونما پہنچتا رہے مگر اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (107:6) یہ اس کی غرض وغایت سے تو غافل رہتے ہیں اور اس کے محسوس ارکان (قیام' رکوع' سجود وغیرہ) کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضہ خداوندی سے سبکدوش ہو گئے (9:54)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ مقصد حیات یہ ہو کہ دولت اکٹھی کرتا رہے اور پھر گنتا رہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہو گیا اور اب کتنا۔ یعنی وہ ننانویں کے پھیر میں پڑ جائے۔ (ایضاً)۔

خیرات نہیں ہے یہ حق ہے۔ یہ As of right (بطور حق) ہے۔ یہ اس میں سے لیتے ہیں جس کے اندر اس کا حق ہے۔ جو حق لیتا ہے وہ اس کے اوپر یہ نہیں کہتا کہ مجھ پہ کوئی بہت بڑا احسان ہو گیا وہ تو اپنا حق لے رہا ہے۔ جو کسی کو اُس کا حق دیتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ میں نے اس پر کوئی احسان کیا ہے کہ میں نے اس کو دیا ہے۔ وہ تو اس کا حق دے رہا ہے۔ حق کے ساتھ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ (70:24) کہا ہے۔ یہ بات چپکے سے نہیں کہی ہے۔ یہ تو اُس قسم کے نظام میں اس قسم کے قانون ہونگے جو نافذ کیے ہوئے ہونگے۔ اس بات کا ہر ایک کو علم ہوگا کہ جس کی ذرا ضرورت رکے گی' جس کا چلتا ہوا کام رکے گا' اس کا حق ہوگا' کہ نظام اس کا انتظام کرے گا' مملکت اسلامی اس قسم کا بندوبست کرے گی کہ کوئی ایسا رہے ہی نہیں کہ جس کی ضرورت رکی ہوئی ہو۔ وہاں کیفیت یہ نہیں ہے:

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست [1]

(اقبالؒ)

بات روٹی کی ہی نہیں ہے عزتِ نفس کی بھی ہے۔ کوئی شخص ذلیل ہوتا ہے جب کوئی شخص حاکم ہو اور یہ اس کا محکوم ہو تو ذلت تو آ گئی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے ہر بنی آدم کو صاحبِ تکریم پیدا کیا ہے تو وہاں کوئی حاکم و محکوم بھی نہیں ہوتا' سائل و محروم بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہاں جو کہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ o لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70:24-25) ابھی ابھی ہم نے سورۃ الماعون میں دیکھا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ [2] (107:1)۔

یوم الدین کی تصدیق کرنے والے

ان مصلین کو تم نے دیکھا ہے جو دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہنے کے بعد کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے مال میں

---

[1] ہمارے ہاں (یعنی اسلامی مملکت میں) کوئی شخص اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا اس لیے کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا اور جب کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا تو پھر نہ کوئی کسی کا غلام ہوتا ہے نہ کوئی غلاموں کا آقا۔ حتیٰ کہ نہ یہاں کوئی حاکم ہے اور نہ محکوم۔ خدا نے جو غیر متبدل قوانین عطا فرمائے ہیں سب انہی کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں اور کوئی انسان کسی انسان پر حکومت نہیں کرتا۔ یہی قرآنی تعلیم کا مقصود و منتہیٰ اور یہی اسلامی دستور و آئین کا ماحصل و لب لباب ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن عملاً دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یعنی اس کا طرزِ عمل اس امر کی دلیل ہے کہ اگر دینداری یہی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا ہے تو پھر دین کا ہر دعویٰ جھوٹا ہے۔ (53:33; 95:7; 75:32-33) (ایضاً)۔

سائل ومحروم کا معلوم حق ہے' کہا کہ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ (70:26) یہ ہیں جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ تکذیب کرتے تھے' دیکھا آپ نے تصریفِ آیات سے' قرآن کی آیات کو ملانے سے' مطلب کتنا اجاگر ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ تکذیبِ دین کرتا ہے جو بے کس اور تنہا رہ جانے والے کو دھکا دیتا ہے' مسکین کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا' رزق کے چشموں کو بہتے ہوئے پانی کی طرح نہیں رہنے دیتا' بند لگا کے روک لیتا ہے۔ اور دین کی تصدیق وہ کرتا ہے جن کے مال میں مسکین اور محروم کا حقِ معلوم ہوتا ہے اور وہ انہیں دیتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو وَالَّذِیْنَ ھُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ (70:27) جانتے ہیں کہ اگر غلط نظام پیدا ہوا' جس میں مال کو جمع کیا' روک کے رکھا' بند کر کے رکھا' وہاں سائل بھی محروم ہوئے' یتیم بھی ہوئے' ان کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے جو تباہی آتی ہے یہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کسی طرح وہ تباہی نہ آجائے' وہ ڈرتے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّھِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ (70:28) جب وہ تباہی آتی ہے تو کوئی بھی اس میں مامون نہیں رہتا' اس تباہی سے کسی کو کہیں بھی پناہ نہیں ملتی۔ اس قسم کا معاشرہ تباہ ہو کر رہتا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ اس فتنے سے خوف کھاؤ' محتاط رہو' اس کو روکو' آنے نہ دو' کیونکہ جب وہ آیا کرتا ہے تو وہ صرف ظالموں تک [1] ہی نہیں ہوتا' انہی کو نہیں پکڑا کرتا جنہوں نے ظلم کیا تھا۔ اس سیلاب کے اندر تو سارے بہہ جایا کرتے ہیں۔ روکو' اس فتنے کو نہ آنے دو' اس تباہی کو نہ آنے دو جس کی یہ کیفیت ہے۔ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں مصلین کہا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! ذہن میں یہ نہ رکھیے کہ یہ جو ہمارے ہاں کی صلوٰۃ کے اجتماعات ہیں اور اس کی یہ شکلیں ہیں' میں اس کی تنقیص کر رہا ہوں۔ وہ اس نظام میں ضروری چیزیں ہیں لیکن وہ اسی صورت میں ہیں کہ جب ان اجتماعات کا' اس صلوٰۃ کا' اور اس نماز کا' نتیجہ یہ ہو کہ وہ معاشرے سے اُن چیزوں کو دُور کرے' اور یہ چیزیں پیدا کرے۔ ان کے اندر صلوٰۃ کا ایک نظام ہے' یہ کوئی ہنگامی Prayer (دعا یا نماز) نہیں ہے۔ اس صلوٰۃ کا نتیجہ قرآن نے خود بتا دیا کہ اس کے اندر کوئی بھوکا نہیں رہے گا' کوئی محتاج نہیں رہے گا' یہ لوگ اس تباہی سے ڈریں گے جو اس قسم کے نظام کا نتیجہ ہوتی ہے۔

---

[1] وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (8:25) (اور اسے بھی یاد رکھو کہ اگر جماعت میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو اس قسم کے تذبذب میں گرفتار ہوں) تو اس سے جو مصیبت آتی ہے وہ صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہتی وہ سارے کے سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اہل یورپ کی حالت زار

عزیزانِ من! یورپ نے اپنے ہاں جو نظام قائم کیا تھا' اس نظام کے نتیجے میں' اس وقت' جس قدر آہ وفغاں' وہاں ہورہی ہے اس کے مقابلے میں ہمارے دکھ تو دبے ہوئے دکھ ہیں' وہ تو ہم اندر ہی اندر آہ وفغاں کررہے ہیں لیکن اگر آپ نے ترقی یافتہ قوموں کا لٹریچر پڑھا ہو تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ کس قدر چیخ رہے ہیں اُس قیامت سے جو غلط نظام کی وجہ سے ان پہ آئی ہوئی ہے۔ یہ Physically (طبعی طور پہ) چاند پہ پہنچ رہے ہیں لیکن معاشرتی طور پر ان کے ہاں گھر کے اندر بھی کوئی اپنے آپ کو مامون نہیں تصور کرسکتا۔ غلط نظام یہ ہوا کرتا ہے۔ یہ مصلین وہ لوگ ہیں جو اُس نظام کو قائم کریں گے۔ آگے چند آیات میں بتایا ہے کہ اُن کی خوبیاں کیا ہیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ المعارج کی آیت 28 تک آ گئے ہیں' 29 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀❀❀.....❀